جاوید احمد غامدی

# مقامات

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

Marfat.com

جاوید احمد غامدی

# مقامات

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

297-3
غ 154 م
159143
ک ا

ناشر: المورد

طابع: فائن پرنٹرز، لاہور

طبع سوم: اپریل 2017ء

قیمت:

ISBN: 978-969-8799-35-9

Address: Post Box 5185, Lahore Pakistan.
Website: www.al-mawrid.org
Email : info@al-mawrid.org, almawrid@brain.net.pk

Marfat.com

# فہرست

## ذوق و شوق


| | | |
|---|---|---|
| ۱ | میرا نام | ۱۵ |
| ۲ | روداد سفر | ۲۰ |
| ۳ | قافلہ در قافلہ | ۳۱ |
| ۴ | میرے بعد | ۴۶ |
| ۵ | رفیق صبوحی | ۵۰ |
| ۶ | می باقی | ۵۳ |
| ۷ | شعلہ و نشیمن | ۵۶ |
| ۸ | معجزۂ فن | ۵۸ |
| ۹ | بہ آشیاں نہ نشینم | ۶۰ |
| ۱۰ | دبستان شبلی | ۶۲ |
| ۱۱ | امین احسن | ۷۱ |


Marfat.com

۱۲ دیدۂ صورت پرست ماست .. .. .. .. ۱۰۳
۱۳ دینی و لادینی .. .. .. .. ۱۰۶
۱۴ نیا فتنہ .. .. .. .. ۱۰۸

## دین و دانش

۱ ایمان بالغیب .. .. .. .. ۱۱۳
۲ اضطراری علم .. .. .. .. ۱۱۴
۳ علم کی بنیاد .. .. .. .. ۱۲۳
۴ قطعی الدلالۃ .. .. .. .. ۱۳۱
۵ قطعی اور ظنی .. .. .. .. ۱۳۷
۶ عام اور خاص .. .. .. .. ۱۴۱
۷ اصول و مبادی .. .. .. .. ۱۴۵
۸ حدیث و سنت .. .. .. .. ۱۴۹
۹ اجتہاد .. .. .. .. ۱۵۲
۱۰ اجماع .. .. .. .. ۱۵۶
۱۱ حدیث کی تدوین جدید .. .. .. .. ۱۶۲
۱۲ ہماری دعوت .. .. .. .. ۱۶۶
۱۳ مسلمانوں کا زوال .. .. .. .. ۱۷۰

Marfat.com

| | | |
|---|---|---|
| ۱۴ | مسئلۂ قومیت | ۱۷۵ |
| ۱۵ | اسلامی تہذیب | ۱۷۷ |
| ۱۶ | اسلامی حکومت | ۱۷۹ |
| ۱۷ | اسلام اور ریاست | ۱۸۴ |
| ۱۸ | نفاذ شریعت | ۱۸۷ |
| ۱۹ | خدا کے فیصلے | ۱۹۳ |
| ۲۰ | مذہبی انتہا پسندی | ۱۹۷ |
| ۲۱ | جہاد و قتال | ۲۰۲ |
| ۲۲ | نہی عن المنکر | ۲۰۶ |
| ۲۳ | حلال و حرام | ۲۰۹ |
| ۲۴ | سود کا مسئلہ | ۲۱۲ |
| ۲۵ | بیمہ | ۲۱۷ |
| ۲۶ | یتیم پوتے کی وراثت | ۲۲۰ |
| ۲۷ | وصیت کا حق | ۲۲۵ |
| ۲۸ | تقسیم وراثت | ۲۲۷ |
| ۲۹ | رویت ہلال کا مسئلہ | ۲۳۲ |
| ۳۰ | اعضا کی پیوند کاری | ۲۳۴ |


Marfat.com

| | | |
|---|---|---|
| ۳۱ | ڈاڑھی اور اسبال ازار | ۲۳۷ |
| ۳۲ | عورت کی تادیب | ۲۳۹ |
| ۳۳ | طلاق کا حق | ۲۴۱ |
| ۳۴ | طلاق کے غلط طریقے | ۲۴۴ |
| ۳۵ | سر کی اوڑھنی | ۲۴۸ |
| ۳۶ | نیل پالش | ۲۴۹ |
| ۳۷ | عورتوں کا سفر | ۲۵۱ |
| ۳۸ | اسقاط حمل | ۲۵۳ |
| ۳۹ | ضبط ولادت | ۲۵۶ |
| ۴۰ | حفظ فروج | ۲۵۹ |
| ۴۱ | مباشرت کے حدود | ۲۶۱ |
| ۴۲ | ایصال ثواب | ۲۶۵ |
| ۴۳ | توہین رسالت کی سزا | ۲۷۰ |
| ۴۴ | قتل عمد کی سزا | ۲۸۲ |
| ۴۵ | زبان کا ایک اسلوب | ۲۹۰ |
| ۴۶ | محمد اور احمد | ۲۹۵ |


Marfat.com

## نقد و نظر


| | | |
|---|---|---|
| ۱ | دین اور عقل | ۲۹۹ |
| ۲ | علم و تحقیق کا المیہ | ۳۰۱ |
| ۳ | قرآن کا موضوع | ۳۰۵ |
| ۴ | طالبان کا استدلال | ۳۰۸ |
| ۵ | قرآن اور اسیران جنگ | ۳۱۵ |
| ۶ | سیدہ عائشہ کی عمر | ۳۲۳ |
| ۷ | ہماری تعلیم | ۳۲۸ |
| ۸ | تعلیمی نظام | ۳۳۹ |
| ۹ | ہماری مسجدیں | ۳۴۳ |


Marfat.com

Marfat.com

# دیباچہ

یہ متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے۔ میں نے اِسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے: پہلا حصہ میرے جذبات واحساسات اور حالات ووقائع کا مرقع ہے۔ دوسرے میں بعض توضیحات اور دین کے اجتہادی مسائل سے متعلق میری آرا بیان ہوئی ہیں۔ تیسرا حصہ تنقیدی مضامین کے لیے خاص ہے۔ علم وفکر اور قلم و قرطاس کی دنیا میں کم وبیش ربع صدی کا سفر ہے جس کے کچھ اہم منازل اِس کتاب میں نمایاں ہوگئے ہیں۔ اِس کے لیے ''مقامات'' کا نام اِسی لحاظ سے تجویز کیا گیا ہے:

کارواں رفتہ واندازۂ جاہش پیداست
زیں نشاں ہا کہ بہ ہر راہ گذار افتادست

المورد، لاہور
اکتوبر ۲۰۰۸ء

—— جاوید

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

ذوق وشوق

Marfat.com

میرے پاس ادیب کا قلم ہے، نہ عالم کا دماغ۔ میری حیثیت بس ایک طالب علم کی ہے۔ میں اِس سفر کی ابتدا اللہ کے بھروسے پر کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگلوں نے یہ راستہ بڑی شان کے ساتھ طے کیا ہے۔ اُن کے نقوش قدم میرے سامنے ہیں۔ میں مقامات و منازل کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے نفس کی کمزوریوں کا احساس ہے۔ میں اِس راہ کو اختیار نہ کرتا، لیکن میں جانتا ہوں کہ اِس کے سوا ہر راہ خسارے کی راہ ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اللہ اِس راہ پر چلنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ میں نے قلم اِسی اعتماد پر اٹھایا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ خیال و خامہ کو ایک دن اُس کے حضور میں جواب دہ ہونا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے حق کہنے اور حق کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ علیه توکلت و إلیه أنیب۔

[۱۹۷۹ء]

Marfat.com

# میرا نام

میرے نام کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ والدہ کو ''جاوید'' پسند تھا۔ پیدائش کے بعد والد اپنے شیخ سے دعا کرانے کے لیے لے کر گئے تو اُنھوں نے فرمایا: اِس کا نام ہم درویشوں کے طریقے پر ہونا چاہیے۔ اِسے ''کاکوشاہ'' کہا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بادشاہ اِس کے پاس نیاز مندانہ حاضر ہوں گے۔ میری چھوٹی خالہ برسوں والدہ کے پاس رہی تھیں۔ والد اور والدہ، دونوں اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کے ایک بیٹے مجھ سے تین سال بڑے تھے جن کا نام اُنھوں نے ''رفیق'' رکھا تھا۔ اِس کی مناسبت سے اُنھیں اصرار تھا کہ میرا نام ''شفیق'' رکھا جائے۔ وہ اِس کے سوا کوئی دوسرا نام قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ اِس کے کچھ دنوں بعد بڑی خالہ دیکھنے کے لیے آئیں تو اُنھوں نے فرمایا: میں نے تو پہلے سے اِس کا نام ''کاکا محمد'' رکھا ہوا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ میرے گھر والوں نے اِس کا آسان حل یہ تلاش کیا کہ تمام نام قبول کر لیے۔ چنانچہ یہ بزرگ جب تک زندہ رہے، مجھے اپنی پسند کے ناموں سے پکارتے رہے۔



Marfat.com

مدرسہ میں داخلے کا وقت آیا تو والد موجود نہ تھے۔ اُس زمانے میں بعض اوقات وہ مہینوں کے لیے اپنے شیخ کی خانقاہ کوٹلی مغلاں چلے جاتے تھے۔ اُن کے ایک عزیز دوست تھے جنھیں ہم چچا کہتے تھے۔ والد کی عدم موجودگی میں وہ مجھے داخل کرانے گئے۔ میرے لیے اُسی اسکول کا انتخاب کیا گیا جس میں میرے خالہ زاد بھائی رفیق پڑھتے تھے۔ نام لکھاتے وقت چچا نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سارے نام بتا دیے۔ وہ سخت پریشان ہوئے کہ اب فیصلہ کس طرح کیا جائے۔ اُنھوں نے رفیق کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا: ہمارے گھر میں تو اِسے ''شفیق'' ہی کہتے ہیں۔ چچا نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا اور پھر یہی نام اسکول کے رجسٹر میں درج کرا دیا۔

میں جب شعور کی عمر کو پہنچا تو مجھے والدہ کا رکھا ہوا نام زیادہ پسند آیا، لیکن اب اسکول کے رجسٹر کا کیا کیا جائے؟ اپنے ایک استاد محمد صادق صاحب سے بات کی تو اُنھوں نے فرمایا: اِس مرحلے پر نام تبدیل کرنا تو مشکل ہوگا۔ تمھیں شعر کہنے کا شوق ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ جاوید تخلص کر لو۔ میں تمھارا نام ''شفیق احمد جاوید'' لکھ دیتا ہوں۔ تمھیں ''شفیق'' پسند نہیں تو اپنا قلمی نام ''جاوید احمد'' بھی رکھ سکتے ہو۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ دوست احباب پہلے ہی ''جاوید'' کے نام سے پکارتے تھے۔ چنانچہ کالج کے زمانے سے اِسی نام کی شہرت ہوگئی۔ بعد میں شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ بنانے کا موقع آیا تو سب جگہ یہی نام لکھا گیا۔

میں غالباً نویں جماعت میں تھا کہ اپنے ایک پھوپھی زاد بھائی کی شادی میں



Marfat.com

شرکت کے لیے لاہور آیا۔ یہاں مجھے پہلی مرتبہ دس پندرہ دن تک بڑے چچا محمد لطیف خان صاحب کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ اُنھیں اپنے والد اور میرے دادا نور الٰہی صاحب سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ رات دن وہ مجھے اُن کے قصے سناتے اور بتاتے تھے کہ گاؤں میں تمھارے دادا ایک مصلح کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ اُن کی نیکی، خدا ترسی اور دانائی کی وجہ سے لوگ اپنے جھگڑے چکانے کے لیے اُن کی طرف رجوع کرتے اور اُن کا ہر فیصلہ مان لیتے تھے۔ اُن کی باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ تاثر اتنا شدید تھا کہ میں ہر وقت دادا کے بارے میں سوچتا، یہاں تک کہ کئی دن تک سوتا تو خواب میں بھی اُنھی کو دیکھتا تھا۔

اِس موقع پر خاندان کے ایک دوسرے بزرگ اور بچوں کے لیے دینی کتابوں کے مصنف مقبول انور صاحب داؤدی سے ملاقات ہوئی۔ اُن کی یہ نسبت ہمارے گاؤں ''داؤد'' کی وجہ سے تھی۔ میرے والد کا پورا نام بھی اگرچہ محمد طفیل جنیدی تھا، لیکن بعض اوقات کوئی چیز اچانک متوجہ کر لیتی ہے۔ داؤدی صاحب سے ملنے کے بعد پہلی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ میرے نام کے ساتھ بھی اِس طرح کا کوئی اضافہ ہونا چاہیے۔ لڑکپن میں ایسی خواہشیں بعض اوقات آدمی کے ذہن پر سوار ہو جاتی ہیں۔ میں بھی دن رات یہی سوچتا۔ ایک دن والد صاحب سے اِس موضوع پر بات ہوئی تو اُنھوں نے مقبول صاحب کی اتباع میں ''داؤدی'' کا اضافہ کر لینے کی تجویز دی۔ پھر فرمایا: ہمارے شیخ سے بیعت کر لیتے تو ''جنیدی'' بھی ہو سکتے تھے۔ اِدھر میری



Marfat.com

خواہش تھی کہ یہ نسبت دادا سے ہو۔ چچا سے جو کچھ سن چکا تھا، اُس کی بنا پر اب میرے لیے وہی آئیڈیل تھے۔ میں اُن سے نسبت کے لیے سوچتا تو ''نوری'' اور ''مصلحی'' کے الفاظ ذہن میں آتے تھے، لیکن ذوق اُنھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اِسی حیص بیص میں تھا کہ دو بزرگ ہمارے ہاں مہمان ہوئے۔ والد کا معمول تھا کہ بارہا مہینوں کے لیے سیلانی فقیروں، اطبا اور سنیاسیوں کو اپنے ہاں مہمان ٹھیرا لیتے تھے۔ یہ لوگ بھی اِسی طرح آئے۔ اِن میں سے ایک والد کے پیر بھائی غلام رسول وحشی اور دوسرے کوئی عالم اور سنیاسی تھے جن کا نام عبداللہ تھا۔ وحشی بہت اچھے کاتب تھے۔ اُنھوں نے اپنے شیخ کی کتاب ''لیلیٰ مجنوں'' اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔ وہ اِسے سناتے اور اِس کی شرح و وضاحت میں تصوف کے اسرار و رموز بیان کرتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی دل چسپی عرب جاہلی کی تاریخ سے تھی۔ وہ اِس کے واقعات والد کو سناتے تھے۔ میں اِن بزرگوں کی مجلس میں گھنٹوں بیٹھتا اور بڑی دل چسپی کے ساتھ اُن کی باتیں سنتا تھا۔ عبداللہ صاحب نے اِنھی مجلسوں میں کوئی قصہ سناتے ہوئے بیان کیا کہ بنو غامد کے ابوالآبا نے صدیوں پہلے کسی معاملے پر پردہ ڈالا اور اِس طرح اصلاح احوال کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اِسی بنا پر اُنھیں ''غامد'' کا لقب دیا گیا اور 'غمد الأمر' کے الفاظ اِس کے بعد عربی زبان میں 'أصلح الأمر' کے معنی میں استعمال ہونے لگے۔ اُنھوں نے بتایا کہ یہ قبیلہ جزیرہ نماے عرب میں اِسی نسبت سے غامدی کہلاتا ہے*۔ مجھے فوراً خیال ہوا کہ یہی کام تو میرے دادا کرتے



Marfat.com

تھے۔ اِس کے لیے یہ نئی تعبیر علم میں آئی تو بے حد مسرت ہوئی۔ والد سے ذکر ہوا تو اُنھوں نے بھی پسند کیا۔ میں ضلع ساہیوال کے جس دیہاتی ماحول میں رہتا تھا، وہاں اِس طرح کا نام مذاق بن جاتا۔ اِس لیے میں نے اِسے لکھنا تو بہت بعد میں شروع کیا، لیکن اُسی دن فیصلہ کر لیا کہ یہ لفظ اب میرے نام کا حصہ بن جائے گا۔

بچپن، لڑکپن اور اوائل شباب کی خوشیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بعد میں سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس چیز نے علم و عمل اور فکر و خیال میں کیا اہمیت حاصل کر لی تھی۔ دادا کے ساتھ نسبت کے لیے یہ لفظ مل جانے سے جو خوشی مجھے اُس وقت ہوئی، اُسے میں آج بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وقت کس طرح بدلتا ہے، اب بڑی سے بڑی بات بھی دل و دماغ میں اِس طرح کا کوئی اہتزاز پیدا نہیں کرتی۔ ایسی سب چیزیں عمر کے ساتھ کس قدر بے معنی ہو جاتی ہیں:

ہر روز ایک تازہ جہاں کی حکایتیں
اب رہ گئی ہیں قصۂ عہد شباب میں

[۲۰۰۷ء]

---

*اِس کے بعد لغت کی کتابیں دیکھیں تو اِس کی تصدیق ہوئی۔ چنانچہ ''اقرب الموارد'' میں ہے:

(غامدة) أبو قبيلة ينسب إليها الغامديون، وقيل: هو غامد وإسمه عمرو ولقب به لإصلاحه أمرًا كان بين قومه۔



Marfat.com

# روداد سفر

میں اسکول میں پڑھتا تھا، لیکن والد اِس پر مطمئن نہ تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اِس کے ساتھ عربی، فارسی اور سنسکرت بھی سیکھوں۔ اِس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اِسی دوران میں اُنھوں نے پاک پتن کے نواح میں واقع میاں محمد حسین بودلہ کی جاگیر پر ملازمت کرلی۔ دو تین مہینے وہاں کام کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے تو والدہ نے بھی اُن کے ساتھ میاں صاحب کے گاؤں نانگپال منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ گاؤں سمہ سٹہ جانے والی ریلوے لائن کے اسٹیشن پکا سدھار سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ مجھے پاک پتن کے ایم۔ سی پرائمری اسکول سے اٹھا کر پکا سدھار کے اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہ ایک ہی کمرے کا اسکول تھا جس میں ٹاٹ بھی نہیں تھے۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ بیابان کی جھاڑیوں سے شاخیں توڑتے، اُن کے پتوں سے فرش کی صفائی کرتے اور اُنھی پر بیٹھ جاتے تھے۔ گاؤں میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ والد اُس میں نماز کے لیے جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ مولوی نور احمد صاحب اُس مسجد کے امام اور خطیب تھے۔ اب جو کچھ یاد ہے، اُس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ اُن کا تعلق غالباً دیوبندی مسلک سے تھا۔ والد نے اُن سے میری تعلیم کی بات کی تو اُنھوں نے فرمایا: عربی، فارسی تو اِسے میں پڑھا دوں گا۔ والد بے حد خوش



Marfat.com

ہوئے۔ پھر والدہ کے مشورے سے فیصلہ کیا گیا کہ اسکول سے آنے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لیے آرام کروں گا۔ اِس کے بعد عصر کی نماز کے لیے مسجد جاؤں گا اور مغرب تک مولوی صاحب مجھے فارسی، عربی پڑھائیں گے۔

ہم نانگپال گئے تھے تو میں تیسری جماعت میں تھا۔ پانچویں تک مولوی نور احمد صاحب سے پڑھنے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اُنھوں نے مجھے ''شرح جامی'' تک عربی اور ''پندنامہ'' شیخ عطار تک فارسی پڑھائی۔ پانچویں جماعت کے امتحانات ہونے کو تھے کہ والد کسی بات پر میاں صاحب سے ناراض ہوئے اور ملازمت چھوڑ کر واپس پاک پتن آ گئے۔ مجھے بھی آنا پڑا، لہٰذا مولوی صاحب سے میری تعلیم بھی اِس کے ساتھ ہی منقطع ہوگئی۔ تاہم شوق ختم نہیں ہوا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست، میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ہی کسی استاد تک پہنچ جاتا اور اُس کی رہنمائی میں درس نظامی کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ نویں جماعت تک میں نے فنون کی تمام کتابیں ختم کر لیں۔ اب دسویں کا امتحان درپیش تھا، اِس لیے پوری توجہ اُس کی طرف مبذول ہوگئی اور عربی تعلیم کا سلسلہ ایک مرتبہ پھر ٹوٹ گیا۔

پانچویں جماعت کا امتحان پاس کر لینے کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے میں اسلامیہ ہائی اسکول میں آ گیا تھا۔ یہاں غالباً چھٹی یا ساتویں کے زمانے میں نصیر الدین صاحب ہمایوں سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے۔ یہ اِس لحاظ سے بڑی اہم ملاقات تھی کہ پہلی مرتبہ اُنھی کی وساطت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی



Marfat.com

کے نام اور کام سے میرا تعارف ہوا۔ مولانا کی تمام کتابیں میں نے اُن سے لے کر پڑھیں۔ یہ علم وعمل کی ایک نئی دنیا تھی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع اُنھی دنوں داؤد گارڈن، داروغہ والا میں منعقد ہوا۔ ہم چند دوست بھی اسلامیہ ہائی اسکول سے ہمایوں صاحب کے ساتھ اِس اجتماع میں شرکت کے لیے لاہور آئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو میں نے پہلی مرتبہ اِسی اجتماع کے موقع پر دیکھا۔ کیا دل نواز شخصیت تھی۔ لگتا تھا کہ اِس کی صورت گری میں حسن فطرت کی ہر چیز کام آ گئی ہے۔ بعد میں اُن سے ملنے اور بہت قریب رہ کر اُن کو دیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ علم و عمل، حسن اخلاق، دانش وبصیرت اور جرأت وعزیمت کے لحاظ سے جن شخصیتوں کے نام اُن کے ساتھ لے سکتے ہیں، وہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ یہ صرف میرا تاثر نہیں ہے۔ اُنھیں دیکھنے، ملنے، اُن سے ہم کلام ہونے اور اُن کے ساتھ کام کرنے کی سعادت جن لوگوں کو بھی حاصل ہوئی ہے، وہ اِس کی گواہی دیں گے:

نہ من براں گل عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

دسویں کا سال شروع ہوا تو فلسفہ، تصوف، ادب اور تاریخ کی کتابیں دیکھنے سے میری دل چسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ یہ والد اور اُن سے ملنے والوں کی صحبت کا اثر تھا۔ اِن مضامین کی کوئی کتاب مل جاتی تو ختم کیے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ اِس کے لیے وقت بھی تھا۔ اسکول کی مصروفیت، البتہ کسی حد تک رکاوٹ بنتی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ اِس



۱۵۹۱۴۴

Marfat.com

سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کرنی چاہیے۔ اِسی شوق میں ایک دن اپنے استاد اور اسکول کے صدر مدرس سید شیر محمد صاحب سے میں نے درخواست کی کہ مجھے اسباق میں حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ میں پوری یک سوئی کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے ہاسٹل میں ایک کمرا دے دیں تو دسویں کے نتیجے سے بھی ان شاءاللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ سید صاحب بڑی غیر معمولی شخصیت کے استاد تھے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیسے مان گئے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اُنھوں نے فرمایا: میرے اعتماد کو ٹھیس تو نہیں پہنچاؤ گے؟ میں نے اطمینان دلایا تو اُنھوں نے اگلے ہی دن یہ سہولت فراہم کر دی، بلکہ اِس کے ساتھ ایک مزید عنایت یہ کی کہ اسکول کی لائبریری سے میرے ذوق کی تمام کتابیں بھی اُسی کمرے میں منتقل کر لینے کی اجازت دے دی۔ یہ گوشۂ چمن تو نہیں تھا، مگر 'فراغتے و کتابے' کی ہر صورت میسر ہو گئی تھی۔ دسویں کے امتحانات تک میں اُسی کمرے میں رہا۔ یہ دن یاد آتے ہیں تو سید صاحب بھی ساتھ ہی یاد آتے ہیں۔ میں اُن کا مرقع کھینچنا چاہوں بھی تو نہیں کھینچ سکتا، اِس لیے کہ تشبیہ و تمثیل کے لیے اب اُن جیسے استاد کہاں ملیں گے:

اے تو مجموعۂ خوبی، بچہ نامت خوانم

دسویں کے بعد میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا۔ فلسفہ اور انگریزی ادب میرے اختیاری مضامین تھے۔ بی۔ اے کے ساتھ آنرز کے لیے بھی میں نے انگریزی ادب ہی کا انتخاب کیا۔ گورنمنٹ کالج اُس زمانے میں علم و ادب کے درخشندہ



Marfat.com

ستاروں کی کہکشاں بنا ہوا تھا۔ پروفیسر مرزا منور، صابر لودھی، غلام الثقلین نقوی، ملک بشیر الرحمٰن، پروفیسر سراج، پروفیسر سعید شیخ، پروفیسر بختیار حسین صدیقی اور ڈاکٹر محمد اجمل جیسے علما و ادبا کی صحبتیں طالب علموں کو میسر تھیں۔ پروفیسر اشفاق علی خان کالج کے پرنسپل تھے۔ پڑھنے والوں کے لیے کالج میں ایک بہت اچھی لائبریری تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری بھی زیادہ دور نہ تھیں۔ اُس زمانے کا لاہور خود ایک جہان علم تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالخیر مودودی، مولانا حنیف ندوی، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف، ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، پروفیسر علم الدین سالک، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، فیض احمد فیض، شورش کاشمیری، حفیظ جالندھری، عابد علی عابد، احسان دانش اور احمد ندیم قاسمی جیسے اساطین علم و ادب زندہ تھے اور آدمی جب چاہے، اُن سے استفادے کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تھا۔

اِن میں سے بعض بزرگ تدریس کے لیے بھی آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق صاحب سے میں نے درخواست کی تو اُنھوں نے ''مقامات ہمدانی'' اور مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے ''دارمی'' کا کچھ حصہ پڑھا دیا۔ مولانا اہل حدیث کے ایک جلیل القدر عالم اور ڈاکٹر صاحب عربی زبان و ادب کے ایک جید عالم اور محقق تھے۔ اُن کے والد مولانا اصغر علی روحی شبلی و فراہی کے استاد اور ''حماسہ'' اور ''سبع معلقات'' کے شارح ادیب الہند مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے تلمیذ رشید تھے۔



Marfat.com

ڈاکٹر صاحب زبان وادب کی اسی روایت کے امین تھے۔

میں گورنمنٹ کالج میں کم وبیش پانچ برس رہا۔ میرا معمول تھا کہ صبح گھر سے نکلتا، کالج کے اسباق میں شامل ہوتا، پھر شام تک کسی لائبریری میں بیٹھا رہتا یا لائبریری سے اٹھ کر اِن بزرگوں کی صحبت میں پہنچ جاتا تھا۔ نئی کتابوں کے لیے فیروزسنز اور یونائیٹڈ پبلشرز میں یہ سہولت تھی کہ آدمی جب تک چاہے پڑھتا رہے، دکان کے لوگ بالعموم کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ میں اِن دکانوں پر بھی جاتا اور گھنٹوں کتابیں دیکھتا رہتا تھا۔ اُس زمانے میں بعض کتابیں لکھنے کے منصوبے بنائے، کچھ لکھا بھی، لیکن یہ زیادہ تر منصوبے ہی رہے۔ شعر کہنے کا رجحان بچپن سے تھا۔ وہ اُس زمانے میں بھی کہے اور اُن میں سے کچھ فیروزسنز کے انگریزی ماہنامہ ''پاکستان ریویو'' کے ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء کے شماروں اور بعض دوسرے مجلوں میں شائع بھی ہو گئے، مگر زیادہ توجہ پڑھنے کی طرف رہی۔ لہٰذا کالج کے شب وروز اِسی عیش میں گزر گئے: ''

اوقات ہماں بود کہ با یار بسر رفت

باقی ہمہ بے حاصلی و بے خردی بود

آنرز حصۂ اول کا امتحان پاس کر لینے کے بعد میں اُس کے آخری سال میں تھا کہ امام حمید الدین فراہی کی بعض کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ علم ونظر اور فہم وبصیرت کی ایک حیرت انگیز دنیا تھی جو اِن کتابوں کے اوراق پلٹتے ہی سامنے آ گئی۔ اِن میں سے کسی کتاب کے دیباچے میں امام کے تلمیذ رشید مولانا امین احسن اصلاحی کا ذکر بھی



Marfat.com

تھا۔ اُس کے الفاظ غالباً یہ تھے: 'ثاني اثنين إذ هما يتأدبان بآداب الإمام الفراهي'۔ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ مولانا سے ملاقات کی جائے۔ ''اسلامی جمعیت'' کے ایک دوست نے بتایا کہ وہ لاہور سے باہر کسی گاؤں میں مقیم ہیں۔ اتنا معلوم تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا بھی اُن سے کچھ تعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب اُس زمانے میں کرشن نگر کے کسی محلے میں مطب کرتے اور وہیں رہتے تھے۔ میں لائبریری سے اٹھا اور پوچھتے پوچھتے اُن کے گھر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب مطب کے پچھلے کمرے میں اپنے احباب سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے مولانا کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ حسن اتفاق سے وہ آج ہی اپنے گاؤں رحمٰن آباد سے آئے ہیں اور اِس وقت اپنے داماد نعمان علی صاحب کے ہاں واپڈا کالونی میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ میرے پاس سائیکل تھی۔ میں نے پتا سمجھا اور واپڈا کالونی کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ راہ چلتے ایک صاحب سے رہنمائی چاہی تو اُنھوں نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ مولانا نماز کے لیے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ یہ استاذ امام سے میری پہلی ملاقات تھی۔ مولانا غالباً دو ہفتے لاہور میں رہے۔ میں روزانہ ملاقات کے لیے حاضر ہوتا اور ایک نئی دنیا کی سیر دیکھ کر لوٹتا۔ استاذ امام کے ساتھ یہی ملاقاتیں ہیں جن سے پہلی مرتبہ شرح صدر ہوا کہ دین محض مان لینے کی چیز نہیں ہے، اُسے سمجھا اور سمجھایا بھی جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرآن ایک قول فیصل ہے، دین و شریعت کی ہر چیز کے لیے میزان ہے، پورے عالم کے لیے خدا کی حجت ہے۔ اِس کی روشنی میں ہم حدیث و فقہ،



Marfat.com

فلسفہ وتصوف اور تاریخ وسیر، ہر چیز کا محاکمہ کر سکتے ہیں۔

یہ میرے لیے ایک نئے قرآن کی دریافت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کے طریقے پر قرآن کا طالب علم بننا چاہتا ہوں۔ اپنی تعلیم کا کچھ پس منظر بتا کر پوچھا کہ اِس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ مولانا نے مختلف علوم وفنون کی امہات کتب کی ایک لمبی فہرست بتائی جنھیں پڑھنے، سمجھنے اور دل ودماغ میں اتارنے کے لیے برسوں کی محنت چاہیے تھی۔ مولانا نے فرمایا: اِس طریقے سے پڑھنا چاہتے ہو تو لیڈری کے خیالات ذہن سے نکال کر علم ونظر اور فکر وتدبر کے لیے گوشہ گیر ہونا پڑے گا۔ یہ فیصلہ کرو کہ تمھارا سایہ بھی ساتھ نہ دے تو حق پر قائم رہو گے۔ ہمارے مدرسۂ علمی میں کوئی شخص اِس عزم وارادہ کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔

یہ آخری دن تھا۔ اِس سے اگلے روز مولانا گاؤں واپس جا رہے تھے۔ میں نے دل ودماغ کا جائزہ لیا، نتائج وعواقب کا اندازہ کیا اور اُسی روز فیصلہ کرلیا کہ کالج کو الوداع کہہ کر میں کل ہی مولانا کے مدرسۂ علمی میں داخل ہو جاؤں گا اور اِس کے لیے جیسا علم چاہیے، اُسے حاصل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔

میری طالب علمی کا دوسرا دور اِسی سے شروع ہوا۔ یہ ۱۹۷۳ء کی ایک شام تھی۔ اِس کے بعد یہ سلسلہ کم وبیش دس سال تک جاری رہا۔ اِس دوران میں مولانا نے خود بھی پڑھایا۔ سورۂ زخرف سے آخر تک قرآن مجید، موطا امام مالک، قرآن وحدیث پر تدبر کے اصول ومبادی اور فلسفۂ جدید کے بعض مباحث اُن کے طریقے پر اُنھی سے پڑھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ پڑھے کم لکھے زیادہ لوگ اِس زمانے میں بہت



Marfat.com

ہو گئے ہیں۔ اُن کا ارشاد تھا کہ قلم اُس وقت اٹھایئے، جب کوئی نئی حقیقت سامنے آئے۔ چنانچہ طالب علمی کے اِس دور میں لکھنے کی ہمت کم ہی ہوئی۔ میں شعر کہتا تھا، نثر لکھنے سے مجھے کچھ زیادہ دل چسپی بھی نہیں تھی۔ تاہم چند چیزیں اردو اور عربی زبان میں قلم سے نکلیں، لیکن وہ ایسی ہی تھیں، جیسی کسی نو آموز لکھنے والے کی ہو سکتی ہیں۔ ''

۱۹۸۳ء میں تعلیم کا یہ مرحلہ ختم ہوا تو میرے معتقدات کی دنیا میں ایسا اضطراب پیدا ہو چکا تھا کہ ہر چیز اپنی جگہ چھوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ فقہ، اصول فقہ، تصوف، علم کلام، سب قرآن میں اپنی بنیادیں تلاش کر رہے تھے۔ دین کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ اِس سوال کے جتنے جوابات ابھی تک سامنے تھے، وہ سب اعتراضات کی زد میں تھے۔ میرے تصورات کا قصر منہدم ہو چکا تھا اور نئی تعمیر اب نئے بندوبست کا تقاضا کر رہی تھی۔ اگلے سات سال اِسی بندوبست کی نذر ہو گئے۔ اِس عرصے میں، معلوم نہیں، کتنی وادیاں قطع کیں، کتنے راستے ڈھونڈے، کتنے موڑ مڑے، کتنے پتھر الٹے، اور پاؤں کے آبلوں سے کہاں کہاں کانٹوں کی پیاس بجھائی۔ یہ عجیب سفر تھا۔ ایک کے بعد دوسری منزل گزر رہی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے کیا پیش آنے والا ہے۔ فیضی نے غالباً اِسی طرح کی صورت حال میں کہا تھا:

کس نمی گویدم از منزل اول خبرے
صد بیاباں بہ گذشت و دگرے در پیش است



Marfat.com

اِس زمانے میں اگر کچھ لکھا بھی تو کسی ضرورت کے تحت۔ بت کدۂ تصورات میں 'تراشیدم، پرستیدم، شکستم' کی جو صورت پیدا ہو گئی تھی، اُس میں دوسروں سے کیا کہا جائے؟ یہ دور اِسی طرح گزر گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء میں جا کر وہ زمین کہیں ہموار ہوئی، جہاں نئی تعمیر کے لیے نیو ڈالی جائے۔ زندگی کے چالیس سال پورے ہونے کو تھے۔ فکر و خیال میں بڑی حد تک وضوح پیدا ہو چکا تھا اور نقشۂ کار بھی واضح تھا۔ میں نے تصنیف و تالیف کا ایک پروگرام ترتیب دیا اور اِس کے مطابق کام کی ابتدا کر دی۔ پچھلے سترہ سال سے اِسی کے مطابق کام کر رہا ہوں۔ بہت کچھ ہو چکا اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو یہ بھی ہو جائے گا۔ چند دن پہلے ''میزان'' پایۂ تکمیل کو پہنچی تو خیال ہوا کہ اِس موقع پر یہ داستان سنا دی جائے۔ اِسی تقریب سے اپنے کام کا نقشہ یہاں بیان کر رہا ہوں۔ یہ کتابیں ہیں جن میں سے کچھ لکھی جا چکی اور کچھ زیر تصنیف ہیں:

۱۔ البیان

قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر ہے۔

۲۔ میزان

اسلام کو میں نے جس طرح سمجھا ہے، یہ اُس کا بیان ہے۔

۳۔ برہان

یہ اُن مباحث کی تنقیح کے لیے خاص ہے، جہاں میرا نقطۂ نظر دوسرے علما سے



Marfat.com

مختلف ہے۔

۴۔مقامات

پہلی دو کتابوں کے علاوہ جو کچھ لکھا ہے یا لکھنے کا ارادہ ہے، اُس کے منتخبات اِس کتاب میں جمع کرنا پیش نظر ہے۔

۵۔الاسلام

''میزان'' کا خلاصہ ہے۔

۶۔علم النبی

۷۔فقہ النبی

۸۔سیرۃ النبی

یہ تینوں کتابیں احادیث وآثار کی جمع وتدوین اور اُن کے متون کی تنقیح کے لیے ترتیب دینا چاہتا ہوں۔

۹۔خیال وخامہ

شعر کہتا رہا ہوں، یہ اُن کا مجموعہ ہے۔

''برہان''، ''مقامات'' اور ''خیال وخامہ'' شائع ہو چکی ہیں۔ اِن میں مضامین اور منظومات کا اضافہ، البتہ ہوتا رہتا ہے۔ ''میزان''، امید ہے کہ اِس سال کے آخر تک شائع ہو جائے گی۔ ''البیان'' میں سورۂ نساء تک پہنچا ہوں۔ اِس سے فارغ ہو گیا تو باقی عمران شاء اللہ حدیث کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گا۔ زندگی کی تمنا اگر ہے تو



Marfat.com

اب اسی کے لیے ہے۔ ابوالکلام کا تصرف قبول کر لیا جائے تو زمانی یزدی کا یہ شعر ہر لحاظ سے حسب حال ہے:

حکایت از قد آں یار دل نواز کنیم
بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم!

[۲۰۰۷ء]

# قافلہ در قافلہ

میں نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھولی، وہ اسلامی انقلاب کے لیے قائم ہونے والے اداروں اور تنظیموں کا دور تھا۔ انسان اپنے گردوپیش سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ کالج کے زمانے میں ہم چند دوستوں نے بھی ''دائرۃ الفکر'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُن میں یارِ عزیز ڈاکٹر ساجد علی سب سے نمایاں تھے۔ وہ اِس وقت پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے سربراہ ہیں۔ لنک میکلوڈ روڈ پر میرے پاس کرایے کا ایک کمرا تھا۔ ماہنامہ ''خیال'' کے نام سے میں وہاں سے ایک رسالہ شائع کرنا چاہتا تھا۔ اِس ادارے کی ابتدا اِسی کمرے سے ہوئی۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی انقلاب کے لیے ایک تحریک برپا کی جائے جس میں یہ ادارہ ایک علمی مرکز اور مرکز قیادت کی حیثیت سے کام کرے۔ اِس کے بعد ایک دارالعلوم قائم کرنے کا ارادہ



Marfat.com

تھا۔ہم چاہتے تھے کہ اِس دارالعلوم سے جو لوگ پڑھ کر نکلیں، آیندہ کے لیے تحریک کی قیادت اُنھی میں سے منتخب کی جائے۔ یہ ایک رومانوی تصور تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی جماعت میں جو خامی رہ گئی ہے، وہ اِسی طرح دور کی جاسکتی ہے۔ دو تین ماہ تک ہم لنک میکلوڈ روڈ کے اِس کمرے میں ملتے اور پڑھتے پڑھاتے رہے، لیکن اندازہ ہوا کہ پیش نظر مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اکٹھے گزارنا ضروری ہے۔ چنانچہ اُن دوستوں نے، جو ہاسٹل میں رہتے تھے، فیصلہ کیا کہ وہ ہاسٹل چھوڑ دیں گے اور اپنا سب جیب خرچ اور ہاسٹل کے اخراجات کے لیے ملنے والی رقم ملا کر ایک مکان کرایے پر لیں گے، جہاں اِس تحریک کا مرکز قائم کیا جائے گا۔ میرا گھر اُس زمانے میں لاہور ریلوے اسٹیشن کے پاس محلہ سلطان پورہ میں تھا۔ تلاش شروع ہوئی تو ایک مکان قریب ہی مل گیا اور یہ سب دوست وہاں منتقل ہو گئے۔

ہم جو دارالعلوم قائم کرنا چاہتے تھے، اُس کا نام ہم نے ''جامعہ الحمرا'' تجویز کیا تھا۔ اِس کی رعایت سے ''الحمرا'' کے نام سے ایک مجلّہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ دوستوں کے مشورے سے طے ہوا کہ اِس کے لیے کتابت کے بجاے ٹائپ پر چھاپنے کا طریقہ اختیار کیا جائے، جس میں حروف جوڑ کر عبارت تیار کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کو اِس طریقۂ طباعت کا تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ اِس میں پروف کی غلطیاں بہت ہوتی تھیں جنھیں دقت نظر سے درست کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے ساتھ حادثہ یہ ہوا کہ پروف دیکھ کر ہم پریس والوں کے حوالے کر آئے اور مطمئن ہو گئے کہ غلطیوں کی تصحیح ہو



Marfat.com

جائے گی۔ مگر مجلّہ چھپ کر آیا تو معلوم ہوا کہ جن غلطیوں کی نشان دہی کی گئی تھی، اُن میں سے کوئی غلطی بھی درست نہیں ہوئی۔ اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اُسے ضائع کر دیا جائے۔ یہ پہلا حادثہ تھا جس سے اپنی ناتجربہ کاری کے باعث دوچار ہونا پڑا۔ ابھی اِس کی پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور افتاد آپڑی۔ چند ہی مہینوں کے بعد ہمیں وہ مکان خالی کرنا پڑا جس میں اپنی تحریک کا ایک مرکز ہم نے قائم کر لیا تھا۔ نیا مکان کئی مہینوں کی تگ و دو سے ملا۔ یہ ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک میں ۲۹ نمبر مکان تھا۔ ہم نے خدا کا شکر کیا کہ تعطل کا زمانہ زیادہ طویل نہیں ہوا اور کام ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا ہے۔

۱۹۷۱ء کے جون میں ہماری ملاقات لاہور کے ایک ایڈووکیٹ چودھری محمد انور صاحب سے ہوئی۔ اُن کے ایک بزرگ دوست سید بدر بخاری بھی اِس ملاقات کے موقع پر موجود تھے۔ یہ دونوں ہمارے پروگرام سے بہت متاثر ہوئے۔ اُن کی تجویز تھی کہ اِس کام کو آگے بڑھانے کے لیے علامہ اقبال روڈ پر اُن کے محلے میں درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا جائے۔ ۷؍ جولائی کو یہ حلقہ قائم ہوا اور اِس کے نتیجے میں ہم طالب علموں کو چند بڑوں کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ اِن میں سید ارشد بخاری اور شیخ محمد ارشد سب سے نمایاں تھے۔ یہ دونوں دوست تھے اور واپڈا میں ملازمت کرتے تھے۔ اِس سے پہلے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درسوں میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اِن دونوں کو "ارشدین" کہا کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو برس تک درس و



Marfat.com

تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اب کافی لوگ ہمارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ لہٰذا سید بدر بخاری کی امارت میں تحریک کا باقاعدہ نظم قائم کر دیا گیا۔ اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدنی ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ وہ بھی اُس میں شامل ہو گئے۔ درس کے بعض دوسرے شرکا نے بھی اُس میں شمولیت اختیار کر لی۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ بدر بخاری صاحب عمر کے اُس حصے میں تھے کہ اِس طرح کے کسی نظم کی قیادت اُن کے لیے آسان نہ تھی۔ لہٰذا چند مہینوں کے اندر ہی باہمی مشورے سے یہ تنظیم ختم کر دی گئی۔

مارچ ۱۹۷۳ میں ہم نے ''دائرۃ الفکر'' سے ایک مجلّہ ''اشراق'' کے نام سے چھاپا۔ ہمارا خیال تھا کہ ڈیکلریشن مل جائے گا تو اِسے ایک باقاعدہ رسالے کی صورت دے دیں گے اور اِس کے ذریعے سے اپنی بات لوگوں تک پہنچائیں گے، لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ ڈیکلریشن ملنا آسان نہیں ہے، اِس لیے یہ اسکیم روبہ عمل نہ ہو سکی۔ اِس کے چند ماہ بعد ہمارے مالک مکان نے کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کر دیا۔ اُس وقت کے حالات میں ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ اُس کا مطالبہ پورا کرتے، اِس لیے ماڈل ٹاؤن کا یہ مکان بھی چھوڑنا پڑا۔ اِس کے بعد کئی مہینے تک ہم لوگ منتشر رہے۔ ادارہ بھی معطل رہا۔ خدا خدا کر کے گارڈن ٹاؤن کے احمد بلاک میں ایک مکان ملا۔ دوست جمع ہوئے، ساز و سامان درست کیا گیا اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔



Marfat.com

ہمارے بعض دوستوں کو ''دائرۃ الفکر'' کا نام پسند نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی جگہ ادارے کے لیے ''دارالاشراق'' کا نام اختیار کیا گیا۔ ابتدا میں جو طالب علم اِس سے متعلق ہوئے تھے، اُن میں سے میں اور ساجد علی ہی باقی تھے۔ شیخ افضال احمد، مستنصر میر، چودھری الیاس احمد اور چودھری محمد رفیق نئے رفقا تھے۔ ہمارے دوست ذوالفقار احمد خاں بھی اِسی دور کی یادگار ہیں۔ وہ ہمارے قریب ہی رہتے تھے، اور اگرچہ ادارے سے متعلق نہیں تھے، مگر اُسی کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے۔ یہی معاملہ اصغر نیازی اور محمد طارق میکن کا بھی تھا۔ یہ دونوں دوستانہ تعلق سے ہمارے پاس مقیم تھے۔

اُس زمانے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک روز ملاقات کے لیے گیا تو اِس کام کا بھی ذکر ہوا۔ مولانا نے تفصیلات پوچھیں، رفقا سے تعارف حاصل کیا، میں نے اپنی مشکلات بتائیں، وہ موانع بیان کیے جو کام میں تعطل کا باعث بن جاتے تھے اور اُن سے سرپرستی کی درخواست کی۔ مولانا نے میری یہ درخواست ازراہ عنایت قبول فرمالی۔ چنانچہ اُن کی ہدایت کے مطابق ادارے کے لیے میرے اور مولانا کے نام سے ایک مشترک اکاؤنٹ اچھرہ کے حبیب بنک میں کھولا گیا جس میں مولانا نے اپنی جیب سے ماہانہ ایک ہزار روپے جمع کرانے شروع کر دیے۔ احمد بلاک سے ہم لوگ مولانا کے گھر کے پاس اُنھی کی دی ہوئی ایک عمارت ۱۔اے ذیلدار پارک اچھرہ میں منتقل ہو گئے۔ مولانا کا خیال تھا کہ اِسے ''ادارۂ معارف اسلامی'' کی ایک شاخ یا ایک نئے ادارے کی



Marfat.com

حیثیت سے منظّم کیا جائے گا۔ اِس سے پہلے مولانا ہی کے ایما سے میں ''جماعت اسلامی'' کا رکن بن چکا تھا، لیکن مولانا کا یہ فیصلہ جماعت کے بعض بزرگوں کو پسند نہیں آیا۔ چنانچہ ایک مہم شروع ہوئی اور سات آٹھ مہینے کے بعد ہی میں نے محسوس کرلیا کہ اِن حالات میں یہاں رہ کر کام کرنا ممکن نہ ہوگا۔ جماعت کی یہ خواہش بھی اسلم سلیمی صاحب نے مجھ تک پہنچا دی تھی کہ ادارہ جس عمارت میں قائم ہے، اُسے وہ الیکشن کا دفتر بنانا چاہتی ہے۔ یہ صورت حال بتا رہی تھی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ لہٰذا ہم نے مشورہ کیا، مولانا سے اجازت چاہی اور چودھری الیاس احمد کی دعوت پر لاہور کے قریب ہی واقع اُن کے گاؤں مرید کے منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ۱۹۷۶ء کے آخر میں ہم یہاں پہنچے اور ۱۱ر جنوری ۱۹۷۷ کو جماعت اسلامی پنجاب کے امیر مولانا فتح محمد صاحب کا ایک خط موصول ہوا جس میں اُنھوں نے مطلع کیا تھا کہ جماعت سے میری رکنیت ختم کردی گئی ہے۔ یہ ایک دو سطروں کی تحریر تھی جس میں بغیر کوئی وجہ بتائے فیصلہ سنا دیا گیا تھا کہ میں اب جماعت کا رکن نہیں رہا۔ میاں طفیل محمد صاحب اُس زمانے میں جماعت اسلامی پاکستان کے امیر تھے۔ میں نے اُن کے نام خط لکھا اور اِس فیصلے کے وجوہ معلوم کرنا چاہے، مگر اِس کا کوئی جواب مجھے کبھی نہیں دیا گیا۔

یہ وصل و فصل میرے لیے زندگی کا ایک اہم تجربہ تھا۔ میں نے اِس عرصے میں اپنے عہد کی ایک عظمت کو بہت قریب سے دیکھا، اُن کے ساتھ کھڑے ہو کر نمازیں پڑھیں، اُن سے باتیں کیں، زندگی کے آداب سیکھے، صبر و حکمت کا درس لیا، زبان و بیان



Marfat.com

کی بعض نزاکتیں سمجھیں، ماچھی گوٹ سے پہلے اور بعد میں جو کچھ ہوا، اُس کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر خود اُن کی زبان سے سنا، مولانا اصلاحی کے ساتھ اُن کے علمی اختلافات پر اُن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ امام فراہی کے متعلق اُن کے عقیدت مندانہ تاثرات سنے، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور علامہ اقبال سے اُن کی محبت کی داستان سنی۔ یہ صحبتیں سرمایۂ حیات ہیں اور میں اب بھی مولانا کو اُسی طرح یاد کرتا ہوں، جس طرح ایک مہجور بیٹا اپنے باپ کو یاد کرتا ہے۔ اُن کی جماعت کو بھی میں اپنی برادری سمجھتا ہوں اور پالیسی اور طرزِ عمل سے ہزار اختلافات کے باوجود ایسا ہی تعلق خاطر محسوس کرتا ہوں، جس طرح کوئی شخص اپنے خاندان سے محسوس کرتا ہے۔ میرے خلاف مہم میں جو لوگ پیش پیش رہے، وہ شاید مجھے نہیں جانتے تھے، اِس لیے اُن سے بھی کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں اُن سے حسن ظن رکھتا ہوں کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا، اپنی دانست میں جماعت کی بہتری کے لیے کیا۔ مولانا نے امریکا جانے سے پہلے آخری ملاقات میں مجھ سے کہا تھا: میری عزیز توقعات آپ سے وابستہ ہیں۔ اپنے ناقدین کی بات ہمیشہ توجہ کے ساتھ سنیے، پستی پر اتر آئیں تو 'اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا' کا طریقہ اختیار کیجیے، وہ آپ کو مشتعل کرنا چاہیں تو اُن کے افترا اور بہتان طرازی کے باوجود اشتعال میں آنے سے انکار کر دیجیے، اِس کے بعد خدا آپ کے ساتھ ہوگا اور آپ ان شاء اللہ اُنھیں اپنے میدان میں شکست دیں گے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں مولانا کی یہ نصیحت ہمیشہ میرے پیش نظر رہی ہے۔ یہ اِسی کا اثر ہے کہ:



Marfat.com

اِس دشت بے چراغ میں کرتا ہوں روز و شب
پیدا ہر اک ببول سے سرو و سمن کو میں

لاہور سے مرید کے آجانے کا ذکر تھا کہ مولانا کی صحبتیں یاد آگئیں اور لذید بود حکایت دراز تر گفتم۔ ہمارے ایک نئے رفیق ملک محمد اشرف شادی شدہ تھے۔ یہاں آنے کے بعد میری اور میر صاحب کی بھی شادی ہوگئی۔ اب ہاسٹل کے طریقے پر رہنا ممکن نہ تھا۔ حالات میں جو تبدیلی آئی تھی، اُس کی بنا پر ضروری تھا کہ رفقا کی کفالت کے لیے کوئی معقول بندوبست کیا جائے۔ ہم نے بہت کوشش کی، مگر اِس کے لیے جتنے وسائل چاہییں تھے، وہ کسی طرح میسر نہیں ہوئے۔ لہٰذا کم و بیش دو سال تک مرید کے میں بقا کی جدوجہد کے بعد ہم اِس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اِس ادارے کی بساط لپیٹ دی جائے۔ یہ ۱۹۷۸ء کے اپریل کی کوئی شام تھی، جب ہم نے کئی دن کی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر فیصلہ کر لیا اور برسوں کے ساتھی بادلِ نخواستہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے۔ اِس عرصے میں ''اشراق'' کا ڈیکلریشن مل گیا تھا۔ یہ مستنصر میر کے نام تھا۔ اِس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ رسالے کا اداریہ اِسی موضوع پر تھا اور میں نے اُس میں لکھا تھا:

''...نومبر ۱۹۷۰ء میں وہ اکیڈمی وجود میں آئی جو 'دارالاشراق' کے نام سے لاہور سے ۲۶ کلومیٹر دور مرید کے کی بستی میں اپریل ۱۹۷۸ء تک باقاعدگی سے کام کرتی رہی اور اب کئی ماہ سے معطل ہے۔ میرے کچھ رفقا برسوں کی جدوجہد کے



Marfat.com

بعد گھروں کو لوٹ چکے ہیں، کچھ لوٹ جائیں گے۔ یہ ایک کام تھا جو شروع ہوا اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے سعی و جہد کے بے شمار مراحل سے گزرا اور ختم ہو گیا۔ میرے احباب کا تقاضا ہے کہ میں اِس کام کی نوعیت اور اِس کے تعطل کے وجوہ واسباب پر قلم اٹھاؤں تاکہ وہ لوگ جو اِس کے احیا سے دل چسپی رکھتے ہیں، اگر کچھ کرنے کی ہمت رکھتے ہوں تو کر سکیں۔ میں نہیں جانتا کہ اِس کا دوبارہ آغاز کب ہو سکے گا، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مجھے یقین ہے کہ کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ میرا احساس ہے کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ میرے پروردگار نے چاہا تو یہ قافلہ پھر گرم سفر ہو گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ منتشر ہو گیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دم لینے کے لیے کسی منزل پر ٹھیر گیا ہے۔ شاید زادِ راہ لینے کے لیے، شاید نئے سفر کا آغاز کرنے کے لیے۔ میں آوازِ جرس سن رہا ہوں اور میں نے قلم اٹھا لیا ہے۔"

اِس سے آگے میں نے لکھا تھا:

"...یہ بات شروع ہی سے میرے سامنے تھی کہ یہ کوئی جز وقتی کام نہیں ہے۔ اِس کے لیے آنے والوں کو شب وروز کے لیے آنا ہوگا اور ساری زندگی کے لیے آنا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اِس میں اپنا سب کچھ کھپا دینے کے لیے آئیں گے، اُن کی کفالت کی ذمہ داری بالآخر اِس ادارے کو اٹھانا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے میں نے یہ کام دو جہتوں سے شروع کیا۔ مردانِ کار کی تلاش اور وسائل کی فراہمی کی جدوجہد میں نے ایک ہی وقت میں شروع کی۔ اب میں محسوس کرتا ہوں



Marfat.com

کہ پہلے کام کے لیے میرا مزاج موزوں تر اور دوسرے کے لیے سخت ناموزوں واقع ہوا ہے، اور اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے ارباب عزم کو جمع کر لینے میں جہاں غیر معمولی کامیابی ہوئی، وسائل کو تلاش کرنے میں ویسی ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اِس داستان کو بالتفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہ فرہاد و بیستوں کی حکایت ہے، خارِ مغیلاں کو خونِ دل سے سیراب کرنے کی کہانی ہے۔ میں اِس کو یہاں بہت اختصار کے ساتھ رقم کر رہا ہوں۔ خاطرِ احباب کی گراں باری کا احساس ہے، لیکن اِسے چند حرفوں میں بیان کرنے کا موقع شاید یہی ہے:

پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

یہ کام کب شروع ہوا، عرض کر چکا ہوں۔ ابتدا مشکل تھی، ہو گئی تو احباب وقتاً فوقتاً اِس کام سے متعلق ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۵ء میں اُن کی تعداد سات تک پہنچ گئی۔ اِن میں افضال احمد صاحب اور محمد اشرف صاحب نے معاشیات، ساجد علی صاحب نے فلسفہ، الیاس احمد صاحب نے سیاسیات، محمد رفیق صاحب نے عربی اور مستنصر میر صاحب نے انگریزی میں ایم۔اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ منصور الحمید صاحب ایم بی بی ایس تھے۔ مستنصر میر صاحب نے سی ایس ایس کیا تھا اور سول سروس اکیڈمی میں ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد تقرر سے کچھ روز پہلے ملازمت کا خیال چھوڑ کر حلقۂ درویشاں میں شامل ہو گئے تھے۔ اِن میں سے ہر فرد کا ایثار بے مثال ہے۔ یہ بڑی صلاحیتوں کے حامل نوجوان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن کی عزیمت، اِن کا ذوقِ علم، اِن کا حسنِ طبیعت، اِن کا سوزِ نہاں اِس



Marfat.com

اکیڈمی کی تاریخ کی متاع بے بہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود میں نے اِن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرا احساس ہے کہ یہ آنے والے دور کو بہت کچھ دے سکتے تھے۔لیکن اپنے زمانۂ قیام میں یہ شاید ہی چند ماہ کے لیے اطمینان کے ساتھ کام کر سکے ہوں۔ مالی وسائل کی کمی نے اِس کام کو بار بار معطل کیا ہے۔ اِس کی پوری تاریخ مسلسل بحران کی تاریخ ہے۔ یہاں تدریس بار بار شروع ہو کر ختم ہوئی ہے۔ اِس کے باوجود اللہ کا احسان ہے کہ کچھ کام ہو گیا اور بہت تھوڑا باقی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈیڑھ دو سال مزید کام کرنے کا موقع مل جاتا تو اِس کاوش کا مرحلۂ اول مکمل ہو جاتا۔ اب یہ سب کچھ معطل ہے اور مرید کے کی اِس ارض عقیم میں ہم خدائے لم یزل کے چند ناتواں بندے ایک نئے عزم کے ساتھ اِس کے احیا کے لیے کوشاں ہیں۔ معلوم نہیں، عرصۂ تعطل کب ختم ہو گا۔لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس کام کو ضائع نہیں کریں گے۔"

میری جدوجہد کا پہلا مرحلہ یہاں ختم ہو گیا۔ لاہور واپس آنے کے بعد خیال تھا کہ اب صرف رسالہ نکالوں گا۔"اشراق" کا ڈیکلریشن مستنصر میر کے نام پر مل گیا تھا،لیکن ابھی دو شمارے ہی نکلے تھے کہ میر صاحب کے امریکا جانے کا پروگرام بن گیا۔ پھر میرے اور اُن کے درمیان رسالے کی پالیسی کے بارے میں بھی کچھ اختلاف تھا۔لہٰذا یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور "اشراق" ایک مرتبہ پھر بند کرنا پڑا۔

اِن دنوں چند طلبہ میرے پاس عربی ادب کی بعض کتابیں پڑھنے کے لیے آتے



Marfat.com

تھے۔ مولانا ابوشعیب صفدر علی اور مسعود اکبر پاشا اِن میں سب سے نمایاں تھے۔ ابوشعیب سرگودھا کے ایک عالم اور مولانا حسین علی واں بھچراں کے شاگرد رشید مولانا غلام نقشبند کے فرزند ارجمند تھے۔ اُن کی غیر معمولی صلاحیتوں کے پیش نظر میری خواہش تھی کہ وہ لاہور منتقل ہو جائیں۔ مرید کے کے دور ابتلا میں جن لوگوں نے ہمارے ساتھ غیر معمولی تعاون کیا، اُن میں ہماری برادری کے ایک بزرگ ڈاکٹر فرخ حسین ملک بھی تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو توجہ دلائی تو اُنھوں نے ''فرخ فاؤنڈیشن'' کے نام سے ایک ادارہ بنا دیا جس کے مہتمم مستنصر میر کے والد گرامی صفدر میر بنائے گئے۔ اُنھوں نے میرے ہی ایما سے ایک مجلّہ ''الاعلام'' کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس میں اگرچہ میرا نام بھی لکھا گیا، لیکن تمام عملی ضرورتوں کے لیے ابوشعیب اُس کے مدیر مقرر کیے گئے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اِس کے نتیجے میں اُن کے لیے لاہور میں قیام کے اسباب میسر ہو گئے ہیں، لیکن یہ رسالہ بھی زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ ڈیڑھ دو سال بعد ہی مولانا ابوشعیب کو پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور رسالہ بند ہو گیا۔

یہی دن تھے، جب میں نے استاذ امام سے عرض کیا کہ اب حلقۂ تدبر قرآن کو بھی ایک باقاعدہ ادارے میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ یہ حلقہ اُن کی جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد قائم ہوا تھا۔ مولانا نے یہ تجویز پسند فرمائی۔ اُن کے ایما سے میں نے اِس کا دستور لکھا اور ''ادارۂ تدبر قرآن وحدیث'' کے نام سے یہ ادارہ قائم ہو گیا۔



Marfat.com

سہ ماہی ''تدبر'' اِسی ادارے کے تحت شائع ہوتا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ پیش نظر مقاصد کے لیے اب اِسی میں کام کیا جائے، مگر بہت جلد واضح ہو گیا کہ حلقے کے بزرگ اِسے پسند نہیں کریں گے۔ اِس کے بعد یہی مناسب تھا کہ کوئی کشمکش پیدا کرنے کے بجائے ادارے سے الگ ہو کر اپنے طریقے پر کام کرتا رہوں۔

اُس زمانے میں طلبہ کی ایک جماعت مجھ سے پڑھ رہی تھی۔ اُن میں ایک نعیم رفیع بھی تھے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آتے تو بار بار اصرار کرتے کہ اُس کام کا احیا ہونا چاہیے جو ۱۹۷۸ء میں ختم ہو گیا تھا۔ پچھلے تجربات کی وجہ سے میں اِس کے لیے راضی نہ تھا۔ پھر خالد ظہیر اور آفتاب شمسی جیسے احباب بھی اُن کے ہم نوا ہو گئے تو بالآخر میں آمادہ ہوا۔ سعید نواز صاحب ہمارے دوستوں میں سب سے بزرگ تھے۔ اُن کی سربراہی میں ایک مجلس منتظمہ بنائی گئی۔ اِس کی افتتاحی تقریب استاذ امام امین احسن اصلاحی کے زیر صدارت لاہور کے جناح ہال میں منعقد ہوئی جس میں ارباب علم و دانش کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور جون ۱۹۸۳ میں وہ ادارہ وجود میں آ گیا جو اب ''المورد'' کے نام سے ۵۱ کے ماڈل ٹاؤن میں قائم ہے۔ اِس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۸۵ء میں ''اشراق'' کا احیا بھی ہو گیا۔ ڈیڑھ دو سال یہ ایک مجلّے کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۸۷ء میں مجھے اِس کا ڈیکلریشن مل گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُس وقت سے اب تک یہ رسالہ بغیر کسی انقطاع کے نکل رہا ہے۔ ''رینی ساں'' ۱۹۹۰ء میں نکلنا شروع ہوا۔ وہ بھی اِسی طرح جاری ہے۔ یہ رسالہ ابتدا ہی سے عزیزم شہزاد سلیم کے سپرد ہے۔ ''اشراق''



Marfat.com

میرے پاس رہا، مگر اِس کو بھی اب میں نے اپنے بیٹے معاذ احسن کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ کی مدد شامل حال رہی تو یہ اِسی طرح جاری رہیں گے۔

پچھلے پچیس برسوں میں ''الانصار المسلمون'' اور ''دانش سرا'' کا نظم بھی میرے تعلق سے قائم ہوا اور مولانا وصی مظہر صاحب ندوی اور ڈاکٹر محمد فاروق خان جیسے زعما اِن تنظیموں کے سربراہ رہے، مگر اِن کی عمر چند برسوں سے زیادہ نہیں ہوئی۔ ''المورد''، البتہ گذشتہ ربع صدی سے قائم ہے اور اللہ کی عنایت سے توقع ہے کہ قائم رہے گا۔ ۸۷ء کے بعد ابتلا اور تعطل کا ایک زمانہ اِس پر بھی گزرا ہے، مگر ۱۹۹۱ء میں ہمارے دوست الطاف محمود کی مساعی سے اِس کے احیا کے بعد، اللہ کا شکر ہے کہ اِس کے کاموں میں کبھی کوئی تعطل پیدا نہیں ہوا۔

''یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل مسلمانوں کے اندر صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ وتلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ مذہبی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن چکے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول وفروع کی تحصیل اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔



Marfat.com

یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس کا بنیادی مقصد اسلامی علوم سے متعلق علمی اور تحقیقی کام، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اِس کی نشر واشاعت اور اِس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان واخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو ونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔



Marfat.com

ج۔عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کردی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔ میری تمام سعی و جہد کا محور اب یہی ادارہ ہے۔ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں، اپنے علمی کاموں کے علاوہ اِسی کے لیے خاص کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے علم و عمل میں اخلاص کی دعا ہے:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا "

[۲۰۰۷ء]

## میرے بعد

میرا آبائی وطن اگرچہ ضلع سیالکوٹ کا ایک قصبہ داؤد ہے، لیکن میری پیدایش پاک پتن کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی اور میں اِسی شہر اور اِس کے سواد میں اُس عمر کو



Marfat.com

پہنچا جب دماغ کبھی کبھی سوچنا بند کر دیتا اور دل کبھی کبھی دھڑکنا بھول جاتا ہے اور ہم اِس کے نتیجے میں جو کچھ کرتے ہیں، اُس پر آپ ہی حیران ہوتے ہیں:

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

آج سے کم و بیش بیس سال پہلے اِسی شہر کے ایک مدرسے میں، میں چھٹی یا ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ درس نظامی کی کتابیں بھی اُس وقت تک میں نے غالباً ''کافیہ'' اور ''شرح جامی'' تک پڑھ لی تھیں۔ شہرستان علم کے در وا ہو چکے تھے اور میں اب کوچہ و بازار کی سیر دیکھنے کے لیے ہر روز عصر کے بعد شہر کی میونسپل لائبریری جاتا تھا۔ میرا گھر مضافات میں تھا۔ میں وہاں سے چل کر روزانہ پیدل لائبریری پہنچتا۔ شوق طلب بھی کیا چیز ہے۔ میرا یہ معمول برسوں رہا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ طبیعت نے کبھی خستگی کی شکایت کی ہو:

طالباں را خستگی در راہ نیست
عشق خود راہ ست و ہم خود منزل ست

لائبریری کے راستے میں، میں نے ایک روز دیکھا کہ ایک بنک کے دروازے پر پہرا دینے والے سنتری کی نگاہیں دور تک میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ چھوٹی عمر تھی، دل و دماغ اِس صورت حال سے پہلی مرتبہ خوف و حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دوچار ہوئے۔ اگلے کئی روز یہی ہوا تو خوف و حیرت پر تجسس نے غلبہ پا لیا۔ میں چاہتا تھا



Marfat.com

کہ آگے بڑھ کر اِس کی وجہ معلوم کروں، لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ بھی، معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن راہ نہیں پاتا۔ گویا وہی معاملہ تھا جو غالب کے ساتھ بارگاہ عشق میں ہوا تھا:

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

بہت دن گزر گئے۔ ایک شام میں لائبریری سے واپس آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں خلافت کے موضوع پر ایک علمی کتاب تھی۔ میں راہ چلتے اُس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ مجھے خیال نہیں ہوا کہ بنک قریب آ گیا ہے۔ اچانک میں نے دیکھا، وہ میرا راستہ روکے کھڑا ہے۔ میری نگاہ اُس کے چہرے پر پڑی۔ اُس کی ڈاڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اُس نے غالباً ابھی وضو کیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور اُس کی پیشانی پر سجدوں کا جمال تھا۔ بڑی محبت کے ساتھ اُس نے مجھ سے پوچھا: تم یہ کتاب پڑھو گے؟ تم نصاب کی کتابوں کے علاوہ اِس طرح کی علمی کتابیں بھی پڑھتے ہو؟ میں نے اقرار میں سر ہلایا تو اُس نے کہا: تمھارے ہاتھ میں ایک دن میں نے عربی کی ایک کتاب بھی دیکھی تھی۔ تم عربی جانتے ہو؟ جانتا ہوں، میں نے جواب دیا۔ تم نے عربی کہاں پڑھی ہے؟ اُس نے عربی میں مجھ سے سوال کیا تو میں حیران رہ گیا۔ لمحے بھر کے لیے مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں ہوا۔ میں کبھی اُسے دیکھتا اور کبھی اُس کے جسم پر سنتری کی وردی کو دیکھتا۔ میں نے خواص کے لباس میں جاہل



Marfat.com

دیکھے تھے، یہ میرے لیے پہلا تجربہ تھا کہ میں عوام کے لباس میں ایک عالم کو دیکھ رہا تھا۔

تم جو کتاب لے کر جا رہے ہو، اِسے پڑھ لو۔ یہ ایک بڑے آدمی کی کتاب ہے۔ میں تمھیں ایک اور کتاب دوں گا جس میں اِس کتاب پر علمی تنقید کی گئی ہے۔ تم کوئی راے قائم کرنے سے پہلے اِسے بھی پڑھ لو۔ علم کی دنیا میں اشخاص کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہاں ساری اہمیت صرف دلیل کو حاصل ہے۔

اِس کے دوسرے دن جو کتاب اُنھوں نے مجھے دی، میں نے اُسی دن اُسے ختم کر لیا۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا جب میں دلیل کی اہمیت سے واقف ہوا۔ میری یہی واقفیت آج بھی میری زندگی کی سب سے بڑی متاع ہے۔ میں نے اِسے ایک سنتری سے حاصل کیا تھا۔ بعد میں، میں نے لاہور کی سب سے بڑی درس گاہ میں فلسفہ اور انگریزی ادب کی تعلیم پائی۔ اِس سے بڑی کوئی چیز، حقیقت یہ ہے کہ میں وہاں سے بھی حاصل نہ کر سکا۔ میں نے دورانِ تعلیم میں بارہا سوچا: کاش، میرے سب ہم جماعت اور استاد بھی کبھی لائبریری جاتے ہوئے اِس راستے سے گزرے ہوتے۔

کئی سال بعد، پچھلے ماہ میں پاک پتن گیا۔ ولی محمد صاحب سے اُسی بنک کے دروازے پر ملاقات ہوئی۔ وہ آج بھی وہیں کھڑے تھے جہاں بیس برس پہلے میں نے اُنھیں دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم، اُن کی درس گاہ سے کوئی اور بھی فارغ ہوا یا:

ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

[۱۹۸۶ء]



Marfat.com

# رفیق صبوحی

بارفیقان زخود رفتہ سفر دست نداد

سیر صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردم

سرما کی آمد میرے لیے ہمیشہ بڑے اہتزاز کا باعث ہوتی ہے۔ تاروں کے ڈوبنے سے پہلے جب میں گیس کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر لپکتے شعلوں کو دیکھتا اور خیال و خامہ کو باہم رشتہ بپا کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو جمعیت خاطر کا جو سامان اُس وقت میسر ہوتا ہے، اُس کے بعد کسی بے سروسامانی کا غم باقی نہیں رہتا:

دل کہ جمع ست، غم از بے سروسامانی نیست

فکر جمعیت اگر نیست، پریشانی نیست

لیکن ۲۷ر نومبر کی صبح جب میں نے اِس موسم میں پہلی مرتبہ آتش فسردہ کو شعلہ باری کا اذن دیا تو میں نے دیکھا کہ میرے محسوسات کی دنیا اُس اہتزاز سے بالکل خالی ہے۔ کمرے کی انگیٹھی میں خاموش پڑی آگ تو دیا سلائی کا شعلہ دکھاتے ہی گویا ہو گئی، مگر اِس کے ساتھ لے لینے کے لیے جو آواز اُس روز دل سے اٹھی، اُسے بس ایک نغمۂ خوں گشتہ ہی کہنا چاہیے:



Marfat.com

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟

سوز غم ہائے نہانی اور ہے

ہم جب زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں تو اُس میں گاہے کچھ ساتھ چلنے والے بھی میسر آ ہی جاتے ہیں۔ یہ ہم سفر بارہا آپس میں وفا کے عہد باندھتے اور جو کچھ کہتے ہیں، اکثر اُس کو نباہ دینے کے لیے ایک دوسرے سے بڑی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ پھر کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ وفا کے عہد ریت کے گھروندوں کی طرح بکھر جاتے اور توقعات کی دنیا صحرائے نجد کی طرح ویران ہو جاتی ہے۔ سفر کی ابتدا میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ زندگی کی حقیقتیں اِس قدر تلخ ہوں گی، لیکن اُن کا زہر رگ وپے میں اترتا ہے تو اندر کا انسان باہر آ جاتا اور لوگ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ اُس وقت کوئی شخص اگر اپنی وفا پر قائم رہے تو اندوہ وفا کے سوا اُس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ جانے والے مشتاقانہ اپنی اپنی راہوں پر چلے جاتے ہیں اور وہ حرماں نصیب اپنے عزیز از جان عزیزوں کو خود گاڑی پر بٹھا کر اُسے اسٹیشن پر رینگتے دیکھتا اور پھر تنہا پلیٹ فارم پر کھڑا رہ جاتا ہے:

نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایت زمانہ

اب سے کم وبیش نو برس پہلے نومبر کی اِسی ۲۷ تاریخ کو میں نے اپنے کچھ عزیز از جان عزیزوں کو اِسی طرح رخصت کیا تھا۔ یہ دن ہر سال لوٹ کر آتا رہا، لیکن اِس کی یادوں کا آزار کبھی اِس طرح دل ودماغ پر حاوی نہیں ہوا۔ اب کیا پھر کوئی عزیز از جاں



Marfat.com

پادر رکاب ہوگا؟ میں آتش دان کے سامنے بیٹھا رہا اور میری زبان پر بے اختیار وہ شعر جاری ہو گئے جواب سے نو برس پہلے میں نے اِن جانے والوں کی یاد میں کہے تھے:

مقام شرح جنوں پہ وہی سرور و حضور
نفس نفس وہی تنہا سرود نیم شبی
مری نگاہ سرابوں کی آرزو کا وجود
کہاں سے آئے ندیموں میں ذوق تشنہ لبی

اِسی خطا پہ گریزاں ہیں ہم سفر میرے
کہ میری طبع رواں مصلحت شناس نہیں
وہ ہم سفر کہ زمانے میں جن کی دھوم ہوئی
مثال ماہ تھی تیرہ شبوں میں جن کی جبیں

مرے وجود میں پنہاں وجود کا حاصل
زبان شعر میں اپنے معلقات کہوں
مری نواؤں سے اب وہ بھی آشنا نہ رہے
مرے ندیم، میں شہر جنوں میں تنہا ہوں



Marfat.com

مجھے رفیق صبوحی کی جستجو ہی رہی
مرے سبو کی حقیقت تہ سبو ہی رہی

[۱۹۸۸ء]

# می باقی

حافظ شیراز نے کہا تھا:

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلا را

مجھے نہیں معلوم، شیراز کے شاعر کی یہ آرزو برآئی یا نہیں، لیکن میں نے بارہا دیکھا ہے کہ لاہور کے آب رکنا باد کے کنارے ساقی ہر روز صبوحی لنڈھاتا ہے۔

رکنا باد دیلمی نے جاری کیا تھا اور اُس کے زلال کا ہر جرعہ، حافظ ہی کے کہنے کے مطابق، عمر خضر بخشتا ہے:

ز رکنا باد ما صد لوحش اللہ
کہ عمر خضر می بخشد زلالش

لاہور کی نہر کسی دیلمی نے جاری نہیں کی اور اُس میں زلال بھی نہیں بہتا۔ اُس کے



Marfat.com

پانی میں مٹی اِس طرح ملی ہوئی ہے، جس طرح سمندر میں شور، لیکن جو منظر اُس کی آہستہ خرامی اور اُس کے کناروں پر دورویہ درخت اور سبزہ زار پیدا کرتے ہیں، اُس کے حسن میں وہ سب کچھ ہے جو نگاہوں میں اِس طرح ٹھیرتا ہے کہ پھر نگاہ روبرو کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ آدمی اِس پر نگاہ غلط انداز بھی ڈالے تو واپس نہیں آتی اور زبان بےاختیار کہتی ہے:

دل کے لیے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں

رکنا باد کا پانی ''درۂ اللہ اکبر'' سے آتا ہے۔ آبِ خضر کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُس کا مقام ظلمات ہے۔ دیکھیے، حافظ نے اِس سے کیا مضمون پیدا کیا ہے:

شیراز و آب رکنی و ایں باد خوش نسیم
عیبش مکن کہ خال رخ ہفت کشور است
فرقست از آب خضر کہ ظلمات جای اوست
تا آب ما کہ منبعش ''اللہ اکبر'' است

اپنے شہر کی اِس نہر کا منبع جاننے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ مجھے اِس کی انتہا معلوم ہے۔ رکنا باد، جیسا کہ حافظ نے کہا، ''درۂ اللہ اکبر'' سے شروع ہوتا ہے۔ یہ میرے لیے ہمیشہ مقام 'اللہ اکبر' پر ختم ہوتی ہے۔ اِسے بےشک، قدرت کے ہاتھوں نے تخلیق نہیں کیا، لیکن شہر کی سنگین عمارتوں کے درمیان یہ ہر صاحب ذوق کے لیے



Marfat.com

مراقبۂ سحر کا مقام ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اُس وقت جب پو پھوٹتی اور فضا میں کچھ کچھ روشنی پھیل جاتی ہے، اِسے زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچتے دیکھا ہے۔

اِس زمانے کے شہروں میں رہنے والے، جن کے لیے دن نیمۂ شب کے بعد ختم ہوتا اور صبح نیمۂ روز سے کچھ پہلے طلوع ہوتی ہے، اِسے سمجھ نہ سکیں گے۔ وہ اگر کبھی ڈوبتے تاروں کی چھاؤں میں اِس کے کنارے کھڑے ہو کر صبح کو طلوع ہوتے دیکھیں تو اُنھیں معلوم ہو کہ یہ محض آب جو نہیں، اِس عالم کے بنانے والے تک پہنچنے کا راستہ بھی ہے۔

نئے تمدن نے ہمیں صرف اُس قرآن سے بے تعلق نہیں کیا جس میں حقائق لفظوں کے لباس میں جلوہ گر ہوئے ہیں، اُس قرآن سے بھی محروم کر دیا ہے جس کی آیتیں صحیفۂ فطرت میں لکھی گئیں اور جسے انسان کبھی شب و روز پڑھتا تھا۔ اب وہ پہر دن چڑھے اٹھتا، برگ سیاہ کا پانی اپنے رگ و پے میں اتارتا اور سب سے پہلے اخبار پڑھتا ہے جس میں اُس کے لیے سب خبریں ہوتی ہیں، اُس کی اپنی کوئی خبر نہیں ہوتی۔

اِن روز و شب میں، اُسے کیا معلوم کہ وہ صبوحی کیا ہے جو لاہور کے اِس آب رکناباد کے کنارے لنڈھائی جاتی ہے؟

دیکھیے، کیا شعر یاد آیا۔ کسی نے شاید، اِسی طرح کے کسی مقام پر صبح کو اترتے دیکھ کر کہا تھا:



Marfat.com

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

[۱۹۸۶ء]

# شعلہ و نشیمن

پچھلے چند مہینوں میں مجھے دو مرتبہ اپنا مکان بدلنا پڑا۔ نیو گارڈن ٹاؤن سے اٹھے ہوئے ابھی بہ مشکل پندرہ بیس ہفتے ہوئے تھے کہ اقبال ٹاؤن میں نئے گھر کے مالک نے اُسے بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ گویا وہی معاملہ ہوا کہ:

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

میں نے اِس مکان کی تلاش اور اِسے رہنے کے قابل بنانے میں بڑی محنت اٹھائی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مجھے اتنی جلدی یہاں سے اٹھنا پڑے گا۔ گھر کے مالک کو بھی اِس کا احساس تھا۔ اُس نے بڑی ندامت کے ساتھ اپنی مجبوری کا ذکر کیا۔ میں انکار کر دیتا تو وہ یقیناً خاموش ہو جاتا۔ مجھے خیال ہوا، شعلہ و نشیمن کو جمع کرنے میں جو مزہ ہے، وہ اُس عافیت میں ہرگز نہ ہوگا جو انکار کی صورت میں مجھے یہاں میسر رہے گی۔ میں نے گھر خالی کر دینے کا وعدہ کر لیا:



Marfat.com

از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر
باز ایں نگر کہ شعلۂ در گیرم آرزوست

پچھلے پندرہ برسوں میں، میں نے کئی مکان بدلے ہیں۔ دوسرے کا گھر ایک دن آدمی کو خالی کرنا ہی پڑتا ہے۔ مجھے جب کبھی گھر کا مالک اپنا گھر چھوڑنے کے لیے کہتا ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک بڑی حقیقت کی یاددہانی ہے۔ اِس دنیا میں ہم جس کے گھر میں رہ رہے ہیں، وہ بھی ایک دن یقیناً اِسے چھوڑنے کے لیے کہے گا۔ ہم اِس مالک سے تکرار کر سکتے ہیں، اُس کے سامنے اِس کا بھی امکان نہیں۔ یہاں ہم اپنا سب ساز و برگ ساتھ لے جا سکتے ہیں، وہاں یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ایک دن اُس کا گھر خالی کر دیں اور ہم نے اُسے جس طرح استعمال کیا ہے، اُس کے لیے اُس کے سامنے مسئول ٹھیرائے جائیں۔ یہ اِس عالم کی سب سے بڑی حقیقت ہے جس سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ یہاں ہر حادثہ دراصل اِسی حقیقت کی یاددہانی ہے:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث، مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

[۱۹۸۶ء]



Marfat.com

# معجزۂ فن

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

میں جس محلّہ میں رہتا ہوں، اُس کی جامع مسجد کی پیش گاہ پچھلے کئی مہینوں سے زیرِتعمیر ہے۔ پہلے برآمدے میں بس کچھ سادہ در بنے ہوئے تھے جن سے گزر کر مسجد کے دالان میں داخل ہوتے تھے۔ اب اُنھیں محرابوں میں بدل کر سامنے کنگنی اور تاج بنانے کا فیصلہ ہوا تو تین چار ماہ پہلے تعمیر شروع کر دی گئی۔ میں نے دیکھا کہ برآمدے کی دیوار دنوں میں منہدم ہوئی اور ہفتے عشرے ہی میں نئی تعمیر نیو سے چھت تک کھڑی ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ اب مسجد کا صحن غالباً دو تین ہفتوں میں اینٹ گارے سے خالی ہو جائے گا، لیکن جب معاملہ تاج کی برجیوں اور مناروں تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ وقت کی رفتار تھم گئی اور معماروں کے ہاتھ کام سے رک گئے ہیں۔ پہلے بنا پڑتی نہ تھی کہ دیوار بام تک پہنچ جاتی تھی، اب ایک ایک برجی کے کلس اور کنگروں کی تعمیر میں مہینے گزرتے ہیں۔ یہ میرے محلے کی چھوٹی سی مسجد ہے۔ معلوم نہیں، مسجد عالمگیری، قلعۂ معلّٰی اور تاج محل کی محرابوں اور برجیوں پر اُن کے معماروں نے کتنی مرتبہ آفتاب



Marfat.com

صبح کو افق پر تیرہ ہوتے دیکھا ہوگا۔ کوئی معمار لب لعلیں تراشنے کے لیے بیٹھ جائے تو جب تک دن مہینوں میں نہ بدلیں، کنج دہن بھی نمایاں نہیں ہوتا:

سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

ہر تخلیق اِسی طرح مرتبۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ شعر وہ بھی ہوتے ہیں کہ ردیف و قافیہ میسر ہوتے رہے تو ہر دوسرے مہینے ایک دیوان کی ترتیب سے فارغ ہو گئے، اور وہ بھی جن کے بارے میں کہا گیا کہ:

برائے پاکی لفظے شبے بروز آرد
کہ مرغ و ماہی باشند خفتہ او بیدار

پہلی صورت میں اینٹ مسالا کم نہ پڑے تو نتیجہ دنوں میں سامنے آ جاتا ہے۔
دوسری صورت میں نتیجہ اینٹ مسالے سے نہیں، خونِ جگر سے پیدا ہوتا ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

یہ حادثہ اِس زمانے میں پہلی بار نہیں ہوا کہ لوگ اِن دونوں کے نتائج میں فرق کرنے سے قاصر رہے۔ بنی آدم کی تاریخ بیش تر اِنھی حوادث کا دفتر ہے۔ اِس دنیا میں، اِس سے پہلے بھی بارہا یہ ہو چکا کہ لوگوں نے جعفر زٹلی اور غالب کا مرتبہ اُن کے دیوان میں شعر گن کر طے کرنے کی کوشش کی اور یوحنا و مسیح کے زمانے میں اُن کا مقام اُن کے معتقدین کی تعداد سے متعین کرنا چاہا۔ اِس طرح کے لوگوں سے کون کہے کہ:



Marfat.com

نگاہ تیری فرومایہ، ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

[۱۹۸۹ء]

# بہ آشیاں نہ نشینم

وہ ہستی دنیا سے رخصت ہوگئی جس کا وجود ہمارے لیے رحمت خداوندی کا سایہ تھا۔ ۱۹ر جنوری ۸۶ء کی صبح والد محترم وفات پا گئے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اپنے پاؤں سے چلتے اِس دنیا کو چھوڑیں۔ اللہ نے اُن کی یہ خواہش پوری کردی۔ وہ سوئے تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اگلی صبح نہ دیکھیں گے۔ رات کو معمول کے مطابق تہجد کے لیے اٹھے، وضو کیا، معلوم ہوا سانس لینے میں کچھ دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ ہم سب اُن کے پاس چلے گئے۔ خیال تھا، ابھی سنبھل جائیں گے، لیکن یہ دم ٹھیرنے کے لیے نہیں اکھڑا تھا۔ بستر کے پاس کھڑے تھے۔ ہم نے دیکھا، وہ شاید لیٹنا چاہتے ہیں۔ میں نے مدد کی، اُنھوں نے تکیے پر سر رکھا اور لمحوں میں ہم سے جدا ہوگئے۔

زندگی کا سفر اُنھوں نے اِس بیسویں صدی کے ساتھ شروع کیا۔ بیس بائیس سال کے تھے کہ تصوف کی وادی میں قدم رکھا۔ پھر پوری زندگی وفاداری بشرط استواری کی



Marfat.com

تصویر بنے رہے۔ جسے دین سمجھا، اُس میں کبھی رخصت کی راہ تلاش نہیں کی۔ اپنے شیخ سے بے حد تعلق خاطر تھا۔ کبھی کبھی بڑے درد و سوز کے ساتھ یہ مصرع پڑھتے:

چھوٹی عمرے پریت لگائی ہو گیا سی جو ہونا

میرے اور اُن کے نظریات میں زمین و آسمان کی دوری رہی۔ وہ مجھے اپنے نقطۂ نظر کا قائل کرنے کی کوشش کرتے، میں اُن کے سامنے قرآن و سنت کا نقطۂ نظر پیش کرتا۔ بحث و مناظرہ کی صورت بھی پیدا ہو جاتی، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ باہمی تعلق میں کبھی دوری پیدا نہیں ہوئی۔ گویا وہی معاملہ تھا:

کہ در نہایت دوری ہمیشہ با او یم

وہ ہمیشہ میرے پاس رہے۔ حق یہ ہے کہ میں اُن کی خدمت کا حق ادا نہ کر سکا، لیکن اِس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی محبت کا حق پوری طرح ادا کر گئے۔

اُن کا آبائی پیشہ زمین داری تھا۔ دادا مرحوم کی وفات کے بعد طب سے شغف ہوا۔ پھر اُسی کے ہو رہے۔ جو کمایا، اُس میں سے اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر بہت کم خرچ کیا۔ بارہا سب کچھ شیخ کی نذر کر دیا۔

دنیا کی ہر چیز سے بے تعلق رہے۔ غم اور خوشی کی ہر حالت میں مطمئن اور اپنے معمولات پر قائم۔ صبح نکلتے، اکثر شام کو لوٹتے۔ باہر جب دیکھا، یہی محسوس ہوا کہ وہ صرف سفر سے دل چسپی رکھتے ہیں، اُن کی کوئی منزل نہیں ہے۔ گویا زبان حال سے کہہ رہے ہیں:



Marfat.com

به آشیاں نه نشینم ز لذت پرواز
گہے به شاخ گلم، گاه برلب جویم

راہ چلتے جس طرح کسی کے پاس چند لمحوں کے لیے وہ بیٹھ جاتے تھے، اُسی طرح بیٹھے اور سفر ختم ہو گیا۔ ہم، بے شک نہیں جانتے کہ ہمارا سفر کب ختم ہو گا، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُسے بہر حال ختم ہونا ہے۔ اِس عالم کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ:

عاقبت منزل ما وادی خاموشان است

[۱۹۸۶ء]

# دبستان شبلی

حلقه گرد من زنید اے پیکران آب و گل
آتشے در سینه دارم از نیاگان شما

رات کے پچھلے پہر اپنی مطالعہ کی میز پر بیٹھا ہوں۔ آلۂ تکییف نے کمرے کی ساری گرمی باہر پھینک دی ہے، لیکن سینے کی آتش پر اُس کا زور کیا چلتا، اُس کی انگیٹھی برسوں سے سلگ رہی ہے۔ میں نے بارہا چاہا کہ اُس کی کچھ چنگاریاں ادھر ادھر بجھی



Marfat.com

ہوئی راکھ میں بھی ڈال دوں تو شاید قرار آ جائے، لیکن اِس سے تپ شعلہ کیا کم ہو جائے گی؟

غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید
تپ شعلہ کم نہ گردد زگسستن شرارہ

تاہم آج یہ چنگاریاں خود بے تاب ہیں کہ اِس آگ کا پتا دوسروں کو بھی دیں:

می کشد شعلہ سرے از دل صد پارۂ ما
جوش آتش بود امروز بہ فوارۂ ما

۱۸۵۷ء جہاں ہماری تاریخ کا وہ سال ہے جس میں ہمارے اقبال کا آفتاب برصغیر میں غروب ہوا، وہاں ایک دوسرا آفتاب اِس سال میں مطلع امت پر طلوع بھی ہوا۔ یہ مولانا شبلی کا سال پیدائش ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بقول: وہ ہنگامۂ مشرق میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء کے ہنگامۂ مغرب میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ اُنھی کا دور ہے جس میں مغربی تہذیب سے ہمارا پہلا تعارف ہوا اور اِس کے نتیجے میں یہ امت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ اِن میں سے ایک گروہ اِس بات پر مصر ہوا کہ نہ دین کو خاص اپنے مکتب فکر کے اصول ومبادی اور اپنے اکابر کی رایوں سے بالاتر ہو کر براہ راست قرآن وسنت سے سمجھنا ممکن ہے اور نہ مغربی تہذیب اور اُس کے علوم اِس کے مستحق ہیں کہ وہ کسی پہلو سے اہل دین کی نظروں میں ٹھیریں۔ اِس گروہ کے بڑوں میں قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، محمود الحسن دیو بندی، انور شاہ کاشمیری، حسین احمد مدنی،



Marfat.com

اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثمانی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جن کے نزدیک حق و باطل کا معیار یہی تہذیب اور اُس کے علوم قرار پائے۔ اُن کا سرخیل وہی بڈھا تھا جس کے بارے میں خود شبلی نے کہا تھا:

پیری سے کمر میں اک ذرا خم
توقیر کی صورت مجسم

شبلی اِن دونوں کے مقابلے میں ایک تیسری جماعت کے بانی ہوئے۔ اِس جماعت کے بنیادی اصول دو تھے: ایک یہ کہ ہمارے لیے ترقی یہی ہے کہ ہم پیچھے ہٹتے چلے جائیں، یہاں تک کہ اُس دور میں پہنچ جائیں جب قرآن اتر رہا تھا اور جب خدا کا آخری پیغمبر خود انسانوں سے مخاطب تھا۔ اور دوسرے یہ کہ یہ خود قدیم کی ضرورت ہے کہ ہم جدید سے بھی اُسی طرح آشنا رہیں، جس طرح قدیم سے ہماری شناسائی ہے۔ سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، ابوالاعلیٰ مودودی، حمید الدین فراہی، امین احسن اصلاحی، یہ سب اِسی جماعت کے اکابر ہیں۔ میں اِسے ''دبستانِ شبلی'' کہتا ہوں۔ اقبال بھی زیادہ تر اِسی دبستان سے متعلق رہے۔ اُن کی آواز اِس عہد کی خوب صورت ترین آواز تھی۔ اُن کی شاعری ادبِ عالیہ قرار پائی۔ تاہم فلسفہ و تصوف سے دل چسپی کی وجہ سے اُن کا معاملہ وہی رہا جو اِس سے پہلے ہم اپنی تاریخ میں، مثلاً غزالی کے ہاں دیکھ چکے تھے۔ وہ جس غزالِ رعنا کے اسیر ہوئے، اُس پر چلانے کے لیے تیر کمان میں رکھتے ہیں، پھر اُسے دیکھتے ہیں تو یہی تیر کسی اور کے سینے



Marfat.com

میں ترازو ہو جاتا ہے۔ گویا وہی معاملہ ہے:

خدنگ جعبۂ توفیق امشب در کمانم بود

غزالم در نظر بسیار خوب آمد خطا کردم

سید سلیمان ندوی اگرچہ شبلی کے جانشین ہوئے، لیکن حق یہ ہے کہ وہ پہلے گروہ ہی سے متعلق تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے عملاً اِس حقیقت کو اِس طرح ثابت کیا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی بیعت کر لی۔ عبدالماجد دریابادی کے بارے میں بھی خیال ہوتا ہے کہ شاید اِسی جماعت کے فرد تھے، لیکن اُن کی داستان حیات یہی ہے کہ دانش گاہ الحاد سے نکلے اور سیدھے تھانہ بھون کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ ابوالکلام اِس دور کے عبقری تھے، اُن کی تحریر وخطابت نے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ وہ آئے تو لگتا تھا کہ صحراؤں کی وسعتیں سمٹ گئیں اور دریاؤں کا زور اُن کے سامنے ٹوٹ گیا ہے، لیکن اُن کے علم وعمل کی ناقہ خود اپنے ہی غبار میں گم ہو گئی۔ ابوالاعلیٰ عالم بھی تھے اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ اُن کے حسن طبیعت میں حسن فطرت کی جھلک تھی۔ وہ اُن کے بعد اِس شان سے اِس راہ پر چلے کہ ہر شخص نے یہی خیال کیا کہ اب منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت آگے گئے، لیکن پھر بھی کتنا پیچھے رہ گئے، اِس کا اندازہ کوئی شخص اگر کرنا چاہے تو مثال کے طور پر قرآن مجید کی آیت 'فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا' کے بارے میں فراہی کی تحقیق اور اُن کی تفسیر کو ایک نظر دیکھ لے۔ میں نے آخری عمر میں اُنھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ پاس ادب مانع رہا، ورنہ بارہا جی چاہا کہ اُن کی



Marfat.com

خدمت میں عرض کروں:

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چوتو مرغے کہ اسیر قفسی

اِس دبستان میں جس شخص کو امام العصر کہنا چاہیے، وہ تنہا حمید الدین فراہی ہیں۔ وہ اِس زمین پر خدا کی آیات میں سے ایک آیت تھے۔ سید سلیمان ندوی سے سنیے، وہ اُن کی وفات پر لکھتے ہیں:

''الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن (مفسر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو اور کم از کم ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اِس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء (۱۹ر جمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ) کو اِس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ جس کے فضل و کمال کی مثال آیندہ بظاہر حال عالم اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں۔ جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی۔ عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبل شیراز، عربی کا سوق عکاظ، ایک شخصیت مفرد، لیکن ایک جہان دانش۔ ایک دنیاے معرفت، ایک کائنات علم، ایک گوشہ نشین مجمع کمال، ایک بے نوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ، علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقف اسرار، قرآن پاک کا داناے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہل دنیا



Marfat.com

سے مستغنی، انسانوں کے ردوقبول اور عالم کی دادو تحسین سے بے پروا، گوشۂ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ۔ وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم وتدبر اور درس وتعلیم میں محو، ہر شے سے بے گانہ اور شغل سے ناآشنا تھی۔ افسوس کہ اُن کا علم اُن کے سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل ہوسکا۔ مسودات کا دفتر چھوڑا ہے، مگر افسوس کہ اُس کے چھپنے اور ربط ونظام دینے کا دماغ اب کہاں۔ جو چند رسالے چھپے، وہ عربی میں ہیں، جن سے عوام کیا، علما تک ناقدر شناس ہیں۔ اُن کی زندگی ہمارے لیے سرمایۂ اعتماد تھی اور اُن کا وجود دارالمصنفین کے لیے سہارا تھا۔ افسوس کہ یہ اعتماد اور سہارا جاتا رہا اور صرف اُسی کا اعتماد اور سہارا رہ گیا جس کے سوا کسی کا اعتماد اور سہارا نہیں۔ اِس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ یہ ہستی آئی اور چلی گئی، لیکن دنیا اُن کی قدر ومنزلت کو نہ پہچان سکی اور اُن کے فضل وکمال کی معرفت سے ناآشنا رہی:

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی وکس قدر تو نشناخت دریغ"

یہ شرف تنہا اِسی ہستی کو حاصل ہوا کہ اِس نے سفر شروع کیا تو پھر راہ نہیں چھوڑی۔ چنانچہ اِس راہ کے مسافروں میں منزل بھی تنہا اِسے ہی ملی۔ امین احسن اصلاحی اِسی نابغۂ عصر کے جانشین ہیں۔ وہ اپنے استاد سے آگے نہیں بڑھے تو پیچھے بھی نہیں رہے۔ حمید الدین جس مقام پر پہنچے تھے، اُن کی ساری عمر اُسی کے اسرار ورموز کی وضاحت میں گزری ہے۔ اُن کی ''تدبر قرآن'' تفسیر کی کتابوں میں ایک بے مثال شہ پارۂ علم و



Marfat.com

تحقیق ہے۔ اُن کے قلم سے پچاس برس کے معرکوں کی روداد سنیے تو بقول عرفی:

رح او گوید اگر جنگ وگر صلح کہ من

بہ کشاد گرہ جبہۂ خاقاں رفتم

وہ عمر بھر جن لوگوں میں رہے، اُن میں کم ہی اِس کے اہل تھے کہ اُن کے فضل و کمال کو پہچانتے۔ میں نے اُن کی مجلس میں صدیوں کے عقدے لمحوں میں کھلتے دیکھے اور بار ہا اعتراف کیا ہے کہ:

طے می شود ایں رہ بدرخشیدن برقے

ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم

اب اِس وقت دیکھیے، پہلے گروہ کی عمر پوری ہو چکی۔ اِس کی مثال اب اُس فرسودہ عمارت کی ہے جو نئی تعمیر کے وقت آپ سے آپ ویران ہو جائے گی۔ دوسرا گروہ، اگرچہ ابھی شرف واقتدار کے ایوانوں پر قبضہ کیے ہوئے ہے، لیکن تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ پرانی ضلالتوں کی طرح یہ ضلالت بھی کچھ عرصے کے بعد اُس کے صفحات ہی میں باقی رہ جائے گی۔ آنے والے دور کی امامت ''دبستان شبلی'' کے لیے مقدر ہے۔ تاریخ کے مرسح پر اب پس پردہ اسی کے ظہور کی تیاری ہو رہی ہے۔

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں

میری نگاہوں میں ہے اُس کی سحر بے حجاب



Marfat.com

لیکن یہ خود کس حال میں ہے؟

سید سلیمان ندوی کے خلف ابوالحسن علی ہیں، مگر وہ اُنھی کی طرح اب ندوہ سے زیادہ دیوبند میں ہیں۔ ابوالکلام اِس دنیا سے تنہا رخصت ہوئے۔ ابوالاعلیٰ نے جو لوگ اپنے پیچھے چھوڑے، اُن میں وہ بھی ہیں جو اُن کے جانشین ہوئے اور وہ بھی جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اُنھی کی جانشینی میں لوگوں سے سمع وطاعت کی بیعت لے رہے ہیں۔ ابوالاعلیٰ کی میراث میں سے بہت سی چیزیں اُن دونوں کو ملیں، مگر اُن کے علم وادب اور حسن طبیعت سے کوئی حصہ، افسوس ہے کہ اُنھیں نہیں مل سکا۔ چنانچہ اِن بے چاروں کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہ اِسی پہلے گروہ کے دروازے پر ہاتھ پھیلائیں اور بار بار دھتکارے جائیں، یہاں تک کہ ''دبستان شبلی'' کی ہر 'غلطی' کا کفارہ بھر دیں۔ اِس جماعت میں، بے شک اِن کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص اگر چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ وہ کچھ پڑھے لکھے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اُن کی حیثیت بھی اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ابوالاعلیٰ ہی کے متن کی شرح ہیں۔ عرفی نے صدیوں پہلے شاید اِنھی کے لیے کہا تھا:

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطوں شو

کہ درمیانہ گزینی سراب وتشنہ لبی ست

''دبستان شبلی'' کی آخری نشانی اب امین احسن ہی ہیں۔ اُن کے تلامذہ واحباب



Marfat.com

میں کتنے ہیں جو اِس حقیقت سے آگاہ ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے دس برس سے اِسی احساس کی آگ ہے جو میرے سینے میں سلگ رہی ہے۔ اِس کی چنگاریاں اپنی ہی راکھ میں دب جاتی ہیں، مگر بجھنے نہیں پاتیں:

کہ آتشے کہ نہ میرد ہمیشہ در دل ماست

کبھی جی چاہتا ہے کہ ابوالاعلیٰ کے جانشینوں سے کہوں:

دست ہر نااہل بیمارت کند
سوئے مادر آکہ تیمارت کند

کبھی خیال آتا ہے کہ امین احسن کے حلقۂ سخن سے عرض کروں:

آں نیست کہ من ہم نفساں را بگذارم
با آبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز است

دیکھیے، قلم کی سیاہی خشک ہوگئی۔ یہ حادثہ میرے ساتھ پہلی بار نہیں ہوا۔ میں نے جب بھی یہ داستان سنانی شروع کی، یہیں پہنچ کر ختم ہوگئی۔ کبھی لفظ جواب دے گئے، کبھی رشتۂ معنی میں گانٹھ پڑ گئی، کبھی سننے والے سو گئے، اور آج ــــــ قلم ایں جا رسید سر بشکست۔ یہ شاید، میرے لیے اِس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ:

سخن از تاب وتب شعلہ بہ خس نتواں گفت

[۱۹۸۷ء]



Marfat.com

# امین احسن

اسلام کے دور جدید کا دوسرا عالم دنیا سے رخصت ہو گیا۔

۱۹۳۰ء میں امام حمید الدین فراہی نے اِس عالِم فانی سے رخت سفر باندھا تو صاحب ''معارف'' سید سلیمان ندوی نے اِس دور کے پہلے عالم کا ماتم کیا تھا۔ اِس کے کم و بیش ۶۷ برس بعد آج ہم فراہی کے جانشین امین احسن اصلاحی کا ماتم کر رہے ہیں۔ سقراط و فلاطوں، ابو حنیفہ اور ابو یوسف، ابن تیمیہ اور ابن قیم ـــــ یہ جس طرح ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، فراہی و اصلاحی بھی دنیا میں اب ہمیشہ ایک ہی وجود کے دو نام رہیں گے:

چوں تمام افتد سراپا ناز می گردد نیاز
قیس را لیلیٰ ہمی نامند در صحرای من

علم کا جلال و جمال، فقر کا وقار، عجز کی تمکنت، مجسم استغنا، سراپا محبت، خدا کے آخری الہام کا عہد آفریں شارح، دین و شریعت میں ایک نئی دنیا کا نقیب، صاحب طرز انشا پرداز، صاحب طرز خطیب، حسن تکلم کا وہ انداز کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی:

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق



Marfat.com

میں نے امین احسن کو سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں دیکھا اور پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا۔ میرے لیے اُس وقت اُن کا دروازہ 'درنکشودہ' ہی تھا، لیکن میں نے ہمت کی اور اِسی بند دروازے پر بیٹھ گیا:

بردرنکشودہ ساکن شد در دیگر نہ زد

پھر وہ دروازہ کھلا اور اِس طرح کھلا کہ گویا اپنے ہی گھر کا دروازہ بن گیا۔ اُس دن سے آج تک علم وعمل کی جو دولت بھی ملی ہے، خدا کی عنایت سے اور اِسی دروازے سے ملی ہے:

ملکت عاشقی و گنج طرب

ہرچہ دارم زیمن ہمت اوست

۱۹۸۷ء میں جب میں نے ''دبستان شبلی'' کی داستان لکھی تو امام فراہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: امین احسن اصلاحی اِسی نابغۂ عصر کے جانشین ہیں۔ وہ اپنے استاد سے آگے نہیں بڑھے تو پیچھے بھی نہیں رہے۔ حمید الدین جس مقام پر پہنچے تھے، اُن کی ساری عمر اِسی کے اسرار و رموز کی وضاحت میں گزری ہے۔ اُن کی ''تدبر قرآن'' تفسیر کی کتابوں میں ایک بے مثال شہ پارۂ علم وتحقیق ہے۔ اُن کے قلم سے پچاس برس کے معرکوں کی روداد سنیے تو بقول عرفی:

رح او گوید اگر جنگ وگر صلح کہ من

بہ کشاد گرہ جبہۂ خاقاں رفتم



Marfat.com

میں نے لکھا تھا: ''دبستان شبلی'' کی آخری نشانی اب امین احسن ہی ہیں۔ اُن کے تلامذہ واحباب میں کتنے ہیں جو اِس حقیقت سے آگاہ ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے دس برس سے اِسی احساس کی آگ ہے جو میرے سینے میں سلگ رہی ہے۔ اِس کی چنگاریاں اپنی ہی راکھ میں دب جاتی ہیں، مگر بجھنے نہیں پاتیں:

کہ آتشے کہ نہ میرد ہمیشہ در دلِ ماست

اب یہ آخری نشانی بھی دنیا میں نہیں رہی۔ ۱۵ر دسمبر ۱۹۹۷ء کو صبح ۳ بجے، ٹھیک اُسی وقت جب وہ اپنے پروردگار کے حضور میں حاضری کے لیے اٹھا کرتے تھے، ہمیشہ کے لیے اُس کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ اُن کی ساری زندگی قرآن کے اسلوب ومدعا کی مشکلیں حل کرتے ہوئے گزری۔ اب کیا ہے، جہاں مشکل پیش آئے گی، خود صاحب قرآن سے پوچھ لیں گے۔ اُن کی دنیا تو اب وہ ہے کہ جہاں:

بے پردہ جلوہ ہا بہ نگاہی تواں خرید

امین احسن کیا تھے؟ اب سے کئی برس پہلے جب اِس شہر کے کچھ مذہب فروشوں نے اُن کا مقام معتقدین کی تعداد سے متعین کرنا چاہا تو میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا تھا: مجھے اپنے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا کہ میرا سرمایۂ فخر اگر کچھ ہے تو بس یہی ہے کہ مجھے امین احسن سے شرف تلمذ حاصل ہے، لیکن جہاں تک امین احسن کا تعلق ہے تو میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اُس کی تگ ودو کا ہدف وہ چیزیں کبھی رہی ہی نہیں جن پر یہ لوگ جیتے اور مرتے ہیں۔ اِن زخارف کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی اُس



Marfat.com

نے ہمیشہ اپنی شان سے فروتر سمجھا ہے۔ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے وہ طریقے جو اِن حضرات کے لیے 'هَنِيئًا مَّرِيئًا' ہیں، اُن کا ذکر بھی کوئی شخص اگر اُس کی مجلس میں کبھی کر دے تو اُس کے لیے وہاں باریابی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اُس نے عمر بھر جس چیز کو اپنا شعار قرار دیا، وہ یہ تھی کہ آدمی کا سایہ بھی اگر اُس کا ساتھ نہ دے تو اُسے ہر حال میں حق پر قائم رہنا چاہیے۔ اُس نے معاشرے میں پھیلی ہوئی فکر و عمل کی سب غلاظتوں کو جمع کر کے اُنھیں دلائل فراہم نہیں کیے، دل و دماغ کو اِن غلاظتوں سے پاک کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ ہر پستی میں نہیں اترتا، اُنھیں اُن بلندیوں کی طرف بلاتا ہے جن پر وہ اپنے شعور کے پہلے دن ہی سے فائز رہا ہے۔ اُس کی دنیا علم و دیانت کی دنیا ہے، مذہبی بہروپیوں اور سیاسی بازی گروں کے لیے اِس دنیا میں کوئی جگہ پیدا ہی نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنے ذرۂ ہستی میں ایک صحرا اور اپنے وجود میں ایک سمندر ہے۔ اُس کی اپنی اقلیم ہی میں اُس کے لیے اتنے مشاغل ہیں کہ اِس طرح کی چیزوں کے لیے اُس کے پاس کوئی وقت نہیں ہوتا۔ اُس نے جس میدان میں عمر بھر محنت کی ہے، وہ پیری مریدی کا نہیں، علم و تحقیق کا میدان ہے۔ اُس کی محنت کا حاصل اگر کسی شخص کو دیکھنا ہو تو وہ اُس شہ پارۂ علم و تحقیق کو دیکھے جسے اب دنیا ''تدبر قرآن'' کے نام سے جانتی ہے۔ وہ بندۂ امروز نہیں، مردِ فردا ہے اور اُس کا زمانہ اب بہت زیادہ دور نہیں رہا۔

''تدبر قرآن'' کی تسوید کا کام اِس مردِ فردا نے ۱۹۵۷ء میں کسی وقت شروع کیا۔



Marfat.com

اِس کی تیاری وہ اُس زمانے سے کر رہے تھے جب ۱۹۲۵ء میں امام فراہی نے اپنے گھر کے کسی گوشے میں کھڑے ہوئے اُن سے کہا تھا: امین احسن اخبار نویسی کرتے پھرو گے یا ہم سے قرآن پڑھو گے؟ وہ بتاتے تھے کہ میں اُس زمانے میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اچھے مشاہرے پر کام کر رہا تھا، لیکن میں نے بغیر کسی توقف کے عرض کیا: میں آپ سے قرآن پڑھوں گا۔ امام فراہی نے اپنی اقامت گاہ ہی کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: آپ یہاں ٹھیریں گے، اور میں ادارت سے استعفا دے کر ایک مرتبہ پھر طالب علمانہ زندگی گزارنے کے لیے اُس کمرے میں آ کر ٹھیر گیا۔ بعد میں مولانا سید سلیمان ندوی نے کسی کالج میں پروفیسری کے لیے اُن کا نام تجویز کیا اور کالج کے ذمہ داروں سے ہامی بھر لی کہ وہ اُنھیں راضی کر لیں گے۔ امین احسن کو بتایا گیا تو وہ چلچلاتی دھوپ میں پیدل چلتے ہوئے دارالمصنفین پہنچے اور سید صاحب سے عرض کیا: آپ نے اِس فقیر کا نام تجویز کیا، آپ کا شکریہ، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یہ پیش کش قبول نہ کر سکوں گا۔ امام فراہی کو میں اُن کی زندگی میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ بتاتے تھے کہ سید صاحب بالکل حیران رہ گئے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک غریب طالب علم اتنی بڑی پیش کش اِس طرح ٹھکرا دے گا۔ بعد میں اُنھوں نے ندوہ میں تقریر کرتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ اِس واقعے کا ذکر کیا اور طلبہ سے کہا کہ دیکھو، طالب علم ایسے بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال میں یہ بات کہہ کر چلا آیا، لیکن مجھے اندیشہ رہا کہ استاذ امام اِن دنوں اگر ''دارالمصنفین'' آئے تو ہو سکتا ہے



Marfat.com

کہ سید صاحب اُن سے بات کریں اور وہ مجھے بھیج دینے کا وعدہ کرلیں۔ اُن کا چہرہ ایک عجیب احساس فخر سے تمتما اٹھتا تھا، جب وہ یہ بتاتے تھے کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ استاذ امام وہاں گئے بھی اور سید صاحب نے اُن سے بات بھی کی، لیکن اُنھوں نے صاف کہہ دیا: آپ امین احسن کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ میں یہ ساری محنت آخر کس کے لیے کر رہا ہوں؟

فراہی کی یہ محنت رنگ لائی۔ ۱۹۳۰ء میں جب اُن کی وفات کا وقت قریب ہوا تو اُنھوں نے امین احسن کو بلا بھیجا۔ وہ اُس وقت متھرا کے ایک ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ امین احسن کمرے میں داخل ہوئے تو فراہی نے اُنھیں دیکھ کر کہا: امین آ گئے۔ امین احسن کہتے تھے: اُنھوں نے میرا نام اپنی زبان سے اِس طرح ادا کیا کہ گویا نام نہیں لے رہے، اِس کے معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے علم وفکر کی امانت میرے سپرد کر رہے ہیں۔

امین احسن نے اپنی پوری زندگی اِسی امانت کا حق ادا کرنے میں صرف کر دی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے: ڈرتا ہوں، خدا کے حضور میں فراہی سے ملوں تو وہ میرے کام سے مطمئن نہ ہوں۔

''تدبر قرآن'' کیا ہے؟ وہ اِس کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''میں بلا کسی شائبہ فخر کے، محض بیان واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب میری چالیس سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ



Marfat.com

اِس کتاب کی تیاریوں میں بسر کیا ہے، اوراب اپنے بڑھاپے کی ناتوانیوں کا دور اِسی کی تحریر وتسوید میں بسر کررہا ہوں۔ اِس طویل مدت میں، میں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اور بہت سے تلخ وشیریں گھونٹ حلق سے اتارے ہیں، لیکن اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ کسی دور اور کسی حال میں بھی میرا ذہنی وقلبی تعلق اِس کتاب سے منقطع نہیں ہوا۔ میں نے اِس ساری مدت میں جو کچھ پڑھا ہے، اِسی کو محور بنا کر پڑھا ہے۔ جو کچھ سوچا ہے، اِسی کو سامنے رکھ کر سوچا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ اِسی سے متعلق لکھا ہے۔ میں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورہ پر ڈیرے ڈالے ہیں، ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادبی یا نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اُس پتھر کو الٹنے کی کوشش کی ہے جس کے نیچے سے مجھے کسی سراغ کے ملنے کی توقع ہوئی ہے اور یہ راز بھی میں برملا ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی اِس کام میں کوئی تکان یا افسردگی محسوس نہیں کی، بلکہ ہمیشہ نہایت گہری لذت اور نہایت عمیق راحت کا احساس کیا ہے:

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

میری چالیس سال کی محنتوں کے نتائج کے ساتھ ساتھ، اِس میں میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ۳۰، ۳۵ سال کی کوششوں کے ثمرات بھی ہیں۔ مجھے بڑا فخر ہوتا اگر میں یہ دعویٰ کر سکتا کہ اِس کتاب میں جو کچھ بھی ہے، سب استاذ مرحوم ہی کا افادہ ہے، اِس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ لیکن میں یہ دعویٰ کرنے میں صرف اِس لیے احتیاط کرتا ہوں کہ مبادا میری کوئی غلطی اُن کی طرف



Marfat.com

منسوب ہو جائے۔ مولانا سے میرے استفادے کی شکل یہ نہیں رہی ہے کہ ہر آیت سے متعلق یقین کے ساتھ اُن کی رائے میرے علم میں آ گئی ہو، بلکہ میں نے اُن سے قرآن حکیم پر غور کرنے کے اصول سیکھے ہیں اور خود اُن کی رہنمائی میں پورے پانچ سال اِن اصولوں کا تجربہ کرنے میں بسر کیے ہیں۔ پھر اِنھی اصولوں کو سامنے رکھ کر آج تک کام کرتا رہا ہوں۔ اِس اعتبار سے اگرچہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ یہ سب کچھ استاذ ہی کا فیض ہے، لیکن اِس میں چونکہ بلاواسطہ افادے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ افادے کا بھی بہت بڑا حصہ ہے، اِس وجہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اِس کا جو حصہ مستحکم اور مدلل نظر آئے، اُس کو استاذ مرحوم کا صدقہ سمجھیے اور جو بات کمزور یا غلط نظر آئے، اُس کو میری کم علمی پر محمول فرمائیے۔'' (۴۱/۱)

اُنھوں نے لکھا ہے:

''میں اپنے رب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اِس کتاب میں کسی ایک آیت کی بھی ایسی تفسیر نہیں کی جس میں مجھے کوئی تردد ہو۔ جہاں ذرا بھی تردد ہوا ہے، میں نے بے تکلف اُس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اِسی طرح یہ بات بھی عرض کرتا ہوں کہ کسی ایک مقام میں بھی میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ کسی آیت کو اُس کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنے کسی نظریے یا کسی خیال کی تائید کے لیے استعمال کروں۔ قرآن سے باہر کی کسی چیز سے بھی کبھی میری کوئی خاص قلبی وذہنی وابستگی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہے تو قرآن ہی کے لیے اور قرآن ہی کے تحت ہوئی ہے۔ اِس کتاب کے پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ جہاں کہیں مجھے اپنے استاذ سے



Marfat.com

بھی اختلاف ہوا ہے، میں نے بے جھجک اُس کا بھی اظہار کر دیا ہے۔" (۴۲/۱)

یہ تفسیر لاہور میں بھی لکھی گئی اور برسوں لاہور سے باہر خانقاہ ڈوگراں کے پاس ایک دور افتادہ گاؤں رحمٰن آباد میں سرسے اور شیشم کے درختوں کے نیچے بھی زیرِ تسوید رہی، جہاں نہ بجلی تھی، نہ پنکھا اور نہ تصنیف و تالیف کے لیے کوئی دوسری سہولت۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ مسودہ پسینے سے بھیگ رہا ہے، لیکن مصنف کا قلم اُسی طرح رواں دواں ہے۔ وہ اِس بات سے آگاہ تھے کہ —— بہر یک گل زحمت صد خاری باید کشید —— قرآن کی مشکلوں کو حل کرنے اور اُس سے متعلق اپنے نتائج فکر کو سپردِ قلم کرنے میں وہ دنیا کی ہر مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے:

طالباں را خستگی در راہ نیست
عشق خود راہ ست و ہم خود منزل ست

امین احسن نے یہ تفسیر قرآن پر ایمان کی جس کیفیت میں لکھی ہے، اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یاد ہے، وہ سورۂ رحمٰن کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ 'یَخۡرُجُ مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَالۡمَرۡجَانُ' کے تحت جب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ عام خیال کے مطابق موتی صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں، لیکن قرآن بالکل صریح ہے کہ یہ دونوں ہی پانیوں سے نکلتے ہیں تو اُنھوں نے مجھے تحقیق کے لیے کہا۔ میں نے دیکھا، اُن کے چہرے پر تردد کی کوئی پرچھائیں نہ تھی، بلکہ ایک عجیب اطمینان تھا اور ایمان کی ایک عجیب روشنی تھی۔ اِس موقع پر اُنھوں نے جو کچھ کہا، میں اُسے بعینہٖ تو شاید دہرا نہ سکوں،



Marfat.com

لیکن مدعا یہی تھا کہ خدا کی قسم، اگر موتی خود آ کر بھی مجھے کہیں کہ وہ صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں تو میں اُن سے کہہ دوں گا: تمھیں اپنی تخلیق میں شبہ ہوا ہے، قرآن کا بیان کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔

اُن کی پیدایش ۱۹۰۴ء میں یوپی کے ایک گاؤں بمہور میں ہوئی۔ اُن کے رشتے کے ایک چچا شبلی متکلم ندوی اُس زمانے میں ''مدرستہ الاصلاح'' کے مہتمم تھے۔ اُنھی کے ایما پر امین احسن کے والد نے جنوری ۱۹۱۵ء میں اُنھیں اِس مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ اُن کی ساری تعلیم سرائے میر اعظم گڑھ کی اِسی درس گاہ میں ہوئی۔ یہ ایک دینی مدرسہ تھا، لیکن انگریزی زبان میں اُن کی استعداد اتنی اچھی تھی کہ علوم عالیہ کی کتابیں اِس زبان میں نہ صرف یہ کہ بغیر کسی دقت کے پڑھتے، بلکہ اُن کے ادق مطالب دوسروں کو سمجھا دے سکتے تھے۔ دینی مدارس کے طلبہ بالعموم عربی بولنے پر قدرت نہیں رکھتے، لیکن وہ جب امام فراہی سے استفادے کے لیے اُن کے پاس مقیم تھے تو بے تکلف عربی بولتے تھے۔ مشہور عالم موسیٰ جار اللہ ہندوستان آئے تو امام فراہی سے ملنے مدرستہ الاصلاح بھی گئے۔ امین احسن ہی اُن کے میزبان تھے۔ عربی زبان میں گفتگو اور تقریر پر اُن کی قدرت دیکھ کر ایک دن اُنھوں نے پوچھا: عرب میں کتنے سال گزار کر آئے ہو؟ امین احسن نے جواب دیا: 'ما مست قدمی ھاتین قط بلاد العرب' (میرے اِن دونوں پاؤں کو کبھی سرزمین عرب نے نہیں چھوا)۔ موسیٰ جار اللہ بڑی دیر تک اپنی حیرت کا اظہار کرتے رہے۔



Marfat.com

اِسی زمانے میں ایک مرتبہ محمد علی جوہراور سید سلیمان ندوی جیسے لوگوں کی موجودگی میں نوجوان امین احسن نے تقریر کی۔ اُن کی خطابت کا جو رنگ بعد میں نمایاں ہوا اور جس کی داد اپنے وقت کے بے مثل خطیب سید عطاالله شاہ بخاری نے اِس طرح دی کہ خطیب تو میں بھی ہوں، لیکن تم عالم بھی ہو اور خطیب بھی، اُس کی کچھ جھلک اِس تقریر میں بھی تھی۔ لوگوں نے بہت داد دی، لیکن وہ منتظر تھے کہ استاذ امام کیا کہتے ہیں۔ شام کو درس کے لیے حاضر ہوئے تو کسی نے امام فراہی سے ذکر کیا۔ وہ کچھ دیر دوسروں کی باتیں سنتے رہے، پھر اپنے خاص انداز میں فرمایا: ہاں بھئی، یہ بڑے ابوالکلام آزاد ہیں۔ امین احسن بتاتے تھے کہ اُنھوں نے لفظ 'آزاد' اِس طرح ادا کیا کہ اُن کی یہ تعریف میرے لیے تعریف کم اور تنبیہ زیادہ ہوگئی۔ میرے استاد کی تربیت کا یہی انداز تھا۔

اِس سے پہلے امام فراہی نے مدرسہ کے زمانے میں بھی اُن کی ایک تقریر کی تحسین اِن الفاظ میں کی تھی: ''اِس طالب علم نے بہت اچھی تقریر کی ہے۔'' اِس پر اُن کے استاد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی نے عرض کیا: آپ کی اِس تحسین کی کوئی یادگار بھی اِس کے پاس ہونی چاہیے۔ فراہی نے اپنا ''مجموعۂ تفاسیر'' اُنھیں دیا اور اُس پر لکھا: ''بہ صلۂ حسن تقریر'' اور اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

۱۹۲۵ء میں اُن کے حکم پر وہ مدرسہ کے کسی کام سے ملایا گئے تو اپنے رفیق درس اختر احسن کو خط لکھا۔ اُس میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ: ''سمندر کی سرجوشی کے ایام بہار ہیں۔'' امام فراہی نے پڑھا تو کہا: امین میاں تو ادیب ہیں۔ وہ خود بتاتے تھے کہ



Marfat.com

زمانۂ طالب علمی میں اگر کوئی شخص اُن سے پوچھتا کہ وہ کیا بننا چاہتے ہیں تو وہ کہتے: ادیب الہند۔

اِس دور میں شاعری کا شوق بھی رہا۔طبیعت میں شروع سے شوخی تھی۔مدرسہ میں اپنے ایک استاد کی ہجو لکھ دی۔مولانا نگرامی نے بلایا، تنبیہ کی، کچھ جرمانہ بھی کیا، لیکن ساتھ ہی فرمایا: اِس میں شبہ نہیں کہ تمھاری نظم بہت اچھی ہے۔تاہم یہ شوق اُسی زمانے میں ختم ہو گیا۔بتاتے تھے کہ میں نے شبلی سے موازنہ کیا تو مجھے خیال ہوا کہ میں اُن جیسے شعر نہیں کہہ سکتا۔اِس کے بعد پھر میں نے اِس کوچے میں قدم نہیں رکھا۔

مدرسہ کے زمانے میں ''سبع معلقات'' کا امتحان ہوا۔سید سلیمان ندوی ممتحن تھے۔امین احسن کے پرچے پر اُنھوں نے لکھا: یہ ایک طالب علم کا پرچہ ہے۔مجھے ندوہ کے لیے اِس طرح کے استاد بھی کہاں سے ملیں گے۔

مدرسہ میں جن لوگوں کی اُن سے چشمک رہتی تھی، اُنھوں نے فراہی سے کہا: امین احسن کو نحو سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں ہے۔بتاتے تھے: میں درس میں حاضر ہوا تو آتے ہی استاذ امام نے پوچھا: امین 'لِ' کیا صیغہ ہے؟ میں نے جواب دیا، معنی عرض کیے تو بڑے خشمگیں انداز میں لوگوں کی طرف دیکھا، پھر فرمایا: کون کہتا ہے کہ امین کو نحو نہیں آتی۔

اِسی طرح کے ایک موقع پر امام فراہی نے اپنے درس کے حاضرین سے پوچھا: اِس درس میں سب سے کم سن کون ہے؟ لوگوں نے کہا: امین احسن۔اُنھوں نے پوچھا: سب



Marfat.com

سے بعد میں کون شریک ہوا؟ لوگوں نے کہا: امین احسن۔ اِس پر فرمایا: سیدنا مسیح کا ارشاد ہے کہ کتنے ہیں جو پیچھے آنے والے ہیں، مگر دوسروں سے آگے نکل جائیں گے۔

اپنے اوپر استاد کے اعتماد کا ذکر وہ اِسی اسلوب میں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بتایا کہ لوگوں نے امام فراہی سے کہا: امین تو کہتے ہیں کہ عربی شاعری بھی کوئی شاعری ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ اونٹنی کی تعریف کر رہے ہیں یا محبوبہ کی۔ امام فراہی نے کہا: اُنھیں کسی نے شعر سمجھایا نہیں ہوگا۔ میں آیا تو اُنھوں نے پوچھا: میں نے وہی بات دہرا دی۔ استاذ امام نے کہا: کوئی شعر پڑھو۔ میں نے معلقۂ امرؤالقیس کا پہلا شعر پڑھ دیا: 'قفا نبك من ذكری حبیب و منزل'۔ امام نے کہا: ترجمہ کرو۔ میں نے اُسی طرح ترجمہ کر دیا، جس طرح بالعموم مدرسوں میں کیا جاتا ہے۔ امام نے کہا: نہیں، یوں نہیں۔ اِس طرح ترجمہ کرو کہ: ٹھیرو، ٹھیرو، دوستو، جاناں اور منزل جاناں پہ دو آنسو بہانے دو۔ میں پکار اٹھا: لاریب، شعر ہو گیا، اب یہ شعر ہو گیا ہے۔ وہ کہتے تھے، اِس کے بعد عربی شاعری ہی میری سب سے زیادہ پسندیدہ شاعری ہو گئی۔

فراہی کا ذکر جب اُن کی زبان پر آتا تو آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ اِس کلیم ذروۂ سینائے علم کی باتیں وہ گھنٹوں کرتے، مگر سیر نہ ہوتے تھے۔ بعض واقعات ایسے دل نواز اسلوب میں سناتے کہ معلوم ہوتا، کسی دیوتا کا ذکر کر رہے ہیں۔ بتاتے تھے: ''سبع معلقات'' پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ 'لا' سمجھ میں نہیں آیا۔ سب شارحین کو دیکھا، ادیب الہند مولوی فیض الحسن سہارن پوری کی شرح بھی دیکھی، لیکن کسی



Marfat.com

راے پر اطمینان نہیں ہوا۔ کتاب لے کر امام فراہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اپنے دارالمطالعہ کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے مشکل بیان کی، لمحے بھر کو رکے، جیب سے پنسل نکالی اور میری کتاب پر لکھا: 'لا ھی نادرۃ'۔ میاں، جس طرح تم لوگ نہیں کہتے کہ جس گھڑی میری موت نہ آجائے، یہ اِسی طرح کا 'لا' ہے۔ زبان کے غوامض تک پہنچنے کا یہ انداز صرف استاد ہی کا حصہ تھا۔

فراہی کے آخری زمانے میں ہندوستان کے ایک بڑے عالم نے اُن کی کسی تحریر پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اِس سے پورے علاقے میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مدرستہ الاصلاح کے طلبہ اور اساتذہ، سب پریشان تھے۔ میرے لیے بھی یہ ایک بڑا سانحہ تھا۔ اِسی اضطراب اور پریشانی کے عالم میں فراہی کو ڈھونڈتا ہوا اُن کے دارالمطالعہ کی طرف بھاگا۔ میں نے دیکھا، استاذ امام سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ دوڑ کر وہیں اُنھیں بتایا۔ میں خود جس پریشانی میں تھا، اُن سے بھی اِسی کے لحاظ سے کسی ردعمل کی توقع کر رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے زینے پر رکے، پھر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے: اچھا، یہ جن کا تم ذکر کر رہے ہو، وہ تو مجھے نہیں جانتے۔ میں ہکا بکا اُنھیں دیکھتا کھڑا رہ گیا۔ اِس فتوے پر اِس سے زیادہ بلیغ کوئی تبصرہ شاید کبھی نہ ہو سکے۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں کہتے: فراہی یہ تھے، اِس شان کا کوئی شخص اب تم کہاں سے پیدا کرو گے؟

فراہی سے اُنھوں نے قرآن پڑھا، اُس کی زبان کا وہ ذوق پایا جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ نظم قرآن فراہی کی دریافت ہے، لیکن امین احسن نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن''



Marfat.com

میں اُسے وہاں پہنچا دیا ہے کہ اُس کے منکر بھی اب انکار کے لیے کوئی راہ نہیں پاتے۔ امین احسن کا پایۂ علم وہی تھا جو اِس امت میں مختلف علوم وفنون کے ائمۂ مجتہدین کا رہا ہے۔ زبان، ادب، فلسفہ وحکمت اور قرآن کے معارف، اِن سب میں وہ جس مقام پر فائز تھے، اُس سے آگے کوئی مقام آسانی سے تصور میں نہیں آتا۔ اِن علوم میں لاریب، وہ اپنے وقت کے امام تھے۔ اُن کی بعض نئی تحقیقات سے متعلق جب کوئی شخص اُن سے متقدمین کے کسی حوالے کا تقاضا کرتا تو وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے: مطمئن رہیے، کچھ عرصے کے بعد ہم بھی متقدمین ہی ہو جائیں گے۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ میں نے اُن کی مجلس میں صدیوں کے عقدے لمحوں میں کھلتے دیکھے اور بارہا اعتراف کیا ہے کہ:

طے می شود ایں رہ بدرخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم

اُن کا مقام یہی تھا، لیکن اِس کے باوجود اپنی کسی عزیز سے عزیز رائے اور تحقیق کے خلاف بھی کوئی حق اگر سامنے آ گیا ہے تو اُن کے دل و دماغ کو میں نے اِس طرح اُس کے سامنے جھکتے دیکھا ہے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔ اُن کے مدرسۂ علمی کا میں پچھلی صفوں میں بیٹھنے والا ایک طالب علم ہوں۔ سورۂ توبہ میں 'اَلْاَشْهُرُ الْحُرُمُ' کا مفہوم اُنھوں نے جس طرح متعین کیا ہے، اُس پر مجھے اطمینان نہیں ہو سکا۔ میرا خیال تھا کہ بات بہت سادہ ہے، لیکن اُنھوں نے اِسے جس طرح دیکھا ہے، اِس کے نتیجے



Marfat.com

میں یہ بہت کچھ الجھ گئی ہے۔ اُنھی کے فیض تربیت سے جو کچھ پایا ہے، اُس کی روشنی میں ایک مرتبہ بہت ڈرتے ڈرتے میں نے اپنا نقطۂ نظر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ میری بات سنتے رہے، سوالات بھی کیے، اِس کے بعد چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے، پھر فرمایا: میں نے اِس آیت پر برسوں غور کیا اور اِس کے بعد ایک راے قائم کی تھی، لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر بڑے تاثر کے عالم میں یہ شعر پڑھا:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

امام فراہی کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اُنھیں خیال ہوا کہ جس طرح قرآن اُنھوں نے حمید الدین فراہی جیسے جلیل القدر عالم اور محقق سے پڑھا ہے، اِسی طرح حدیث بھی اِس فن کے کسی جید عالم سے پڑھنی چاہیے۔ ترمذی کے شہرۂ آفاق شارح عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری کا گاؤں اُن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ امین احسن کے والد اُنھیں مولانا کے پاس لے گئے، اُنھوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو محدث مبارک پوری نے فرمایا: آپ تو سب کچھ پڑھے ہوئے ہیں۔ آپ کہیے تو میں اپنی سند آپ کو دے دوں۔ امین احسن نے جواب دیا: مولانا یہ شاہوں کا تاج ہے، اِسے یہ فقیر اِس طرح اپنے سر پر نہیں رکھنا چاہتا۔ میں سند لینے نہیں آیا، آپ سے حدیث سمجھنے آیا ہوں۔ مولانا نے پوچھا: کیا پڑھو گے؟ عرض کیا: آپ ترمذی کے شارح ہیں، وہی پڑھا دیجیے۔ چنانچہ درس شروع ہو گیا۔ پھر سردی ہو یا گرمی، میلوں پیدل چل کر امین



Marfat.com

احسن پوری باقاعدگی کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے:

شوق تو راہ می برد، درد تو زادمی دہد

اپنے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ وہ بڑے لطف میں سنایا کرتے تھے۔ بتاتے تھے کہ ترمذی کی عبارت پڑھتے ہوئے میں نے ایک جگہ بہت اعتماد کے ساتھ 'عرف' کو 'ر' کی زیر کے ساتھ پڑھا۔ مولانا نے ٹوکا: 'أنا لا أعرف عرِف' (میں اِسے 'ر' کی زیر کے ساتھ نہیں جانتا)۔ میں نے اِسی اعتماد کے ساتھ جواب دیا: 'أما أنا فلا أعرف عرَف' (اور میں اِسے 'ر' کی زبر کے ساتھ نہیں جانتا)۔ مولانا نے فرمایا: 'راجع اللغة' (لغت دیکھیے)۔ لغت کی کتاب، غالباً جوہری کی ''صحاح'' کھولی تو استاد ہی کی بات لکھی ہوئی تھی۔ میں کچھ خفیف ہوا تو مسکرائے، پھر فرمایا: 'إستأنف، وللجواد زلة' (آگے چلو، اصیل گھوڑا بھی پھسل جاتا ہے)۔

امام فراہی کی وفات کے بعد اُن کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے اُنھوں نے ''دائرۂ حمیدیہ'' کی بنیاد رکھی۔ اُس کے تحت ''الاصلاح'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اِس دوران میں امام کی کتابوں کے ترجمے کیے اور اِس قدر عمدہ ترجمے کیے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے صاحب طرز انشا پرداز نے اُن کے بارے میں لکھا کہ کسی شخص کو اگر عربی زبان کی اعلیٰ علمی عبارتوں کے اردو میں منتقل کرنے کا سلیقہ سیکھنا ہو تو اُسے یہ ترجمے دیکھنے چاہییں۔

۱۹۴۱ء میں مولانا مودودی حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت لے کر اٹھے تو



Marfat.com

مدرستہ الاصلاح، دائرۂ حمیدیہ، استاد کے مسودات اور علمی کاموں کے لیے اُس زمانے میں اپنے نام پر جمع پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم چھوڑ کر وہ اُن کے ساتھ ''دارالاسلام'' منتقل ہو گئے۔ مولانا مودودی سے اُنھیں اتفاق بھی رہا اور اختلاف بھی۔ اتفاق کے زمانے میں جب بعض علما نے اُن کے علم کا استخفاف کرنا چاہا تو امین احسن کی شہادت ایک برہان قاطع بن کر سامنے آئی۔ بعد میں از راہ تفنن فرمایا کرتے تھے کہ بھائی، وہ میں نے مولویوں کے مقابلے میں اُن کے علم کی شہادت دی تھی، اپنے مقابلے میں نہیں۔ کم و بیش ۱۶ سال وہ مولانا کے سب سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی رہے۔ اُن کے ساتھ ''جماعت'' کی علمی و فکری رہنمائی کا کام بھی کیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی بڑی استقامت کے ساتھ برداشت کیں۔ بتاتے تھے کہ قرآن میں تجزیہ مطالب اور پیروں کی تقسیم کا کام میں نے ملتان جیل میں مکمل کیا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں مولانا کو موت کی سزا ہوئی تو اُن کے جذبات بے پناہ تھے۔ اختلاف کے زمانے میں بھی، جب وہ اُنھیں اپنے مخصوص اسلوب میں ''امیر المومنین'' کہتے اور اُن پر تند و تیز لب و لہجے میں تنقید کر رہے ہوتے تھے، میں نے بارہا اُن کے الفاظ کی تلاطم خیزیوں کے نیچے محبت کا ایک گہرا سمندر موجزن دیکھا ہے۔ اُنھیں افسوس تھا کہ اپنے جس دوست کے بارے میں وہ اتنی اونچی رائے رکھتے تھے، وہ کس دلدل میں اتر گیا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں، میں مولانا مودودی کے گھر کے بالکل سامنے مقیم تھا۔ وہ میرے ہاں تشریف لائے۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے صحن میں نکلے تو مجھ سے پوچھا: مولانا



Marfat.com

مودودی کا گھر یہی ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ میں نے دیکھا کہ وہ بار بار دہرا رہے تھے:

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۱۸رجنوری ۱۹۵۸ءکو یہ آشنائی امین احسن کے اِن الفاظ پر ختم ہوئی:

''میں جانتا ہوں کہ آپ کی رفاقت سے محروم ہوکر میں کیا کچھ کھو رہا ہوں، لیکن آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر آپ نے مجھ جیسے خیر خواہ مخلص کے مشوروں کی قدر نہیں کی تو آپ کو 'برے مشیروں'' کے مشورے ماننے پڑیں گے۔ میں دل سے متمنی تھا کہ مجھے آپ کی رفاقت حاصل رہے، لیکن آپ نے اپنے دونوں خطوں میں اُس کی جو قیمت مانگی ہے، میں وہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔''

مولانا دنیا سے رخصت ہوئے تو بڑے تاسف کے ساتھ فرمایا: آج وہ شخص دنیا سے چلا گیا جس سے اتفاق میں بھی لذت تھی اور اختلاف میں بھی۔ جس دن یہ سانحہ پیش آیا وہ میرے گھر میں تشریف فرما تھے، مولانا کی بذلہ سنجی کا ذکر ہوا تو پٹھان کوٹ کے زمانۂ قیام کے بعض دل چسپ واقعات سنائے۔ اُنھی میں ایک یہ لطیفہ بھی تھا۔ کہنے لگے: میری شادی ہوئی، چودھری عبدالرحمٰن صاحب، میرے خسر مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں کسی وجہ سے اُس روز عصر کی نماز میں حاضر نہیں ہوسکا۔ مولانا سے کسی نے پوچھا: امین احسن نظر نہیں آئے؟ اُنھوں نے برجستہ جواب دیا: بھائی آج صبح سے وہ 'إن الإنسان لفی خسر' میں مبتلا ہیں۔



Marfat.com

بذلہ سنجی اور شوخی کلام میں امین احسن کا معاملہ بھی یہی تھا۔

قید کے زمانے میں مولانا مودودی کی بتیسی غالباً ٹوٹ گئی۔ امین احسن نہیں جانتے تھے کہ مولانا کے دانت مصنوعی ہیں۔ کسی نے بتایا تو دانتوں کی ''تعزیت'' کے لیے مولانا کے پاس گئے۔ بظاہر بہت افسردگی کی کیفیت میں تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑی کے دروازے میں کھڑے ہوئے، پھر کہا: مولانا، افسوس ہے، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور۔

ایک صاحب نے، جن سے دین کی خدمت کے معاملے میں وہ ایک زمانے میں اچھی توقعات رکھتے تھے، بڑے اہتمام کے ساتھ کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کیں۔ اُن میں وہ تمام مکاتب فکر کے علما کو بلاتے اور اُن سے تقریریں کراتے تھے۔ دین کی خدمت کا جو تصور امین احسن رکھتے تھے، اُس میں ظاہر ہے اِس طرح کی چیزوں کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ وہ صاحب اُنھیں بھی دعوت دینے آئے۔ امین احسن نے پوچھا: اِن کانفرنسوں سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ سب نقطہ ہاے نظر کے لوگ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوں۔ اُنھوں نے جواب دیا تو امین احسن نے بے ساختہ کہا: بھانت بھانت کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی یہ خدمت تو ریلوے پچھلے سو سال سے انجام دے رہی ہے۔ میرا خیال ہے، اِس کے لیے آپ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اِس معاملے میں بھی وہ صاحب طرز تھے۔ ایک بڑے عالم اور مصنف سے ناراض



Marfat.com

ہوئے تو اُن پر پڑھے کم، لکھے زیادہ کا فقرہ چست کیا۔ مستشرقین کے اسلوب تحقیق پر تنقید کی تو اِس کے لیے مکھی کو گھس گھس کر بھینس بنانے اور ٹڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھانے کے محاورے ایجاد کیے۔ فاطمہ جناح کی حمایت میں متحدہ محاذ بنا تو اُسے مینڈکوں کی پنسیری باندھنے سے تعبیر کیا۔ اِسی زمانے میں مولانا مودودی کا ایک جملہ بہت مشہور ہوا کہ ایک طرف ایک مرد ہے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں اور دوسری طرف ایک عورت ہے جس میں عورت ہونے کے سوا کوئی خرابی نہیں۔ امین احسن نے اِس پر تبصرہ کیا: تعجب ہے، اِن لوگوں میں کوئی ایک مرد بھی ایسا نہیں نکلا جو ایک ایسے مرد کا مقابلہ کر سکے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں ہے۔ ماچھی گوٹھ کے بعد کوٹ شیر سنگھ کی شوریٰ میں مولانا مودودی امیر جماعت کے لیے غیر معمولی اختیارات کا مطالبہ لے کر اٹھے۔ امین احسن کو اِس سے شدید اختلاف تھا۔ وہ ہمیشہ سے یہ رائے رکھتے تھے کہ ''جماعت'' کے امیر کو شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُنھوں نے جماعت سے استعفا دے دیا۔ اِس پر مولانا مودودی نے اُن کے نام ایک خط میں لکھا:

''میری اِس رائے کو آپ چاہیں تو غلط کہہ سکتے ہیں۔ اِس کے خلاف دلائل دینے کی آپ کو پوری آزادی ہے، حتیٰ کہ آپ کو یہ بھی اختیار ہے کہ اِس کو جو بدتر سے بدتر معنی چاہیں پہنائیں، مگر آپ یہ الزام مجھ پر نہیں لگا سکتے کہ ایک بدنیتی کی بلی مدتوں سے مجرم ضمیر کے تھیلے میں چھپائے پھرتا رہا تھا اور پہلی مرتبہ اِسے موقع



Marfat.com

تاک کر کوٹ شیر سنگھ میں باہر نکال لایا۔ میں اِس رائے کو حق سمجھتا ہوں۔ ہمیشہ اِس کو ظاہر کیا ہے اور تشکیل ''جماعت'' کے بعد سے آج تک اِس پر عملاً کام کرتا رہا ہوں۔ آپ کو پورا حق ہے کہ اِسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اِس کی وجہ سے جماعت کو چھوڑنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ جماعت میں رہتے ہوئے آپ مجلس شوریٰ کے ذہن کو اِس سے مختلف جس رائے کے حق میں بھی ہموار کرنا چاہیں، پوری آزادی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔''

امین احسن نے اِس کا جواب دیا، اور دیکھیے کہ کیا جواب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ نے اپنی ''بلی'' کی تاریخ پیدائش ناحق بیان کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ میں اِس بات سے ناواقف نہیں ہوں کہ یہ بلی آپ کے تھیلے میں روز اول سے موجود ہے، لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ تقسیم سے پہلے الٰہ آباد کی شوریٰ کے اجلاس میں، میں نے اِس کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ یاد نہ ہو تو مذکورہ شوریٰ کی روداد پڑھ لیجیے۔ اُس وقت تو یہ مر نہ سکی، لیکن میں اور جماعت کے دوسرے اہل نظر اِس کی فکر میں رہے اور شوریٰ میں اِس کی موت وحیات کا مسئلہ بار بار چھڑتا رہا، یہاں تک کہ تقسیم کے بعد ہم نے جو دستور بنایا، اُس میں اِس کی موت کا آخری فیصلہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ جب اِس کے قتل کا فیصلہ ہوا تھا تو اُس وقت شرع شریف، مصلحت زمانہ اور اسلامی جمہوریت، سب کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہوا تھا۔ اِس کی تائید میں علما کے فیصلے بھی حاصل کیے گئے تھے اور اہل نظر کی رائیں بھی جمع کی گئی تھیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ آپ اپنے عمل سے وقتاً فوقتاً اِس کو زندہ بھی کرتے رہے، لیکن ہمارے دستور



Marfat.com

نے اِس کی زندگی تسلیم نہیں کی۔ اِس سلسلہ میں جب کبھی آپ نے دستور کی مخالفت کی تو عموماً اپنے اقدامات میں بے بصیرتی کا ثبوت دیا جس سے جماعت کے اہل الرائے اِس بارے میں یک سو ہو گئے کہ یہ ''بلی'' مردہ ہی رہے تو اچھا ہے۔ لیکن آپ پر اِس کی موت بڑی شاق تھی۔ آپ اِس کو حیات تازہ بخشنے کے لیے برابر بے چین رہے۔ اِسی کے عشق میں آپ نے استعفا دیا۔ ماچھی گوٹھ میں آپ نے اِس کے لیے رازداروں کو خلوت میں بلا کر سازش کی۔ پھر کوٹ شیر سنگھ میں اِس پر مسیحائی کا آخری افسوں پڑھا اور یہ واقعی زندہ ہوگئی۔ اب آپ مجھے دعوت دیتے ہیں کہ میں پھر شوریٰ میں آؤں اور اُس کے اندر رہ کر اِس کو مارنے کی کوشش کروں تو میں اِس سے معافی چاہتا ہوں۔ ایک ''بلی'' برسوں کی محنت سے میں نے ماری، آپ نے وہ پھر زندہ کردی اور اب آپ کی مجلس عاملہ نے اِس کی رضاعت و پرورش کی ذمہ داری بھی اٹھالی ہے۔ اب میں پھر اِس کو مارنے میں لگوں تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی ساری زندگی اِس ''گربہ کشی'' ہی کی نذر کردوں۔ آخر یہ کون سا شریفانہ پیشہ ہے۔''

تجزیے اور محاکمے کے موقع پر اُن کا اسلوب یہی تھا۔ ''جائزہ کمیٹی'' پر الزامات کے جواب میں مولانا مودودی کو جو خط اُنھوں نے لکھا ہے، وہ اِس کا بہترین نمونہ ہے۔ شام کے سفیر کبیر نے اُسے پڑھا تو اُس پر اپنے قلم سے لکھ دیا: مولانا، آپ نے خط نہیں لکھا، قاضی کا فیصلہ لکھا ہے۔ ''جماعت اسلامی'' پر مولانا منظور احمد صاحب نعمانی کی فرد قرارداد جرم کے جواب میں بھی یہی اسلوب ہے۔ مولانا مودودی کے



Marfat.com

نظریہ حکمت عملی کا تجزیہ بھی اِسی انداز سے ہوا ہے۔ عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرے میں بھی یہی لب ولہجہ ہے۔ اُن کی یہ تحریریں اُن کے طرز انشا کا ایسا نمونہ ہیں کہ آدمی پڑھتا ہے تو اُن کی شوخی طبیعت اور اُن کے سحر طراز قلم کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں نے اُن کا بڑھاپا دیکھا ہے۔ وہ لوگ جو ''جماعت اسلامی'' سے تعلق کے زمانے میں اُنھیں سنتے رہے ہیں، آج بھی اُن کی خطابت کو یاد کرتے ہیں۔ بعض سننے والوں نے بتایا ہے کہ وہ خطابت کیا تھی، معلوم ہوتا تھا کہ دریا میں ہلکا ہلکا تلاطم آ گیا ہے، پہاڑوں میں کوئی چشمہ ابل رہا ہے، کوئی ندی ہے جو فرازِ کوہ سے وادیوں میں اتر کر اب میدانوں کی طرف رواں دواں ہے۔ اُن کی زبان سے جو لفظ بھی نکلتا، سیدھا دل میں اتر جاتا تھا۔ وہ پیغمبرانہ اذعان کے ساتھ بولتے اور عہد عتیق کے خطیبوں کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ اُن کی زبان پر استدلال بولتا اور ایمان نازل ہوتا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں اُن کی ایک تقریر کا جملہ اِسی کیفیت کا آئینہ دار ہے کہ تم چاہو تو میری گردن پر تلوار رکھ دو، لیکن مجھ سے یہ بات کبھی نہ منوا سکو گے کہ تزکیۂ نفس جیسا پاکیزہ کام اُن جاہلوں کے سپرد کر دوں جو خانقاہوں میں بیٹھے دین فروشی کرتے ہیں۔ ایک نامور صحافی نے بتایا کہ ککری گراؤنڈ کراچی میں وہ تقریر کر رہے تھے اور میں اُن کی یہ تقریر لکھ رہا تھا۔ تقریر کے دوران میں اُن کے منہ سے نکلا: ''اسلام فرماتا ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکے اور پھر یہ کہہ کر کہ اِسے غلط نہ سمجھیے، فرمانے کا حق اگر ہے تو صرف اسلام ہی کو ہے، لفظ و معنی کا وہ بحر مواج پیدا کر دیا کہ میں دیکھتا رہا، سنتا رہا اور یہ بھول گیا کہ



Marfat.com

مجھے یہ سب کچھ لکھنا بھی ہے۔

دین کی دعوت وہ ہمیشہ اِسی اذعان اور ایمان کی اِسی حرارت کے ساتھ دیتے تھے۔

اِس باب میں ایک لطیفہ بھی ہوا۔ ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں ''جماعت اسلامی'' نے اُنھیں الیکشن لڑنے کے لیے کھڑا کر دیا۔ وہ بتاتے تھے کہ میں نے بہت کہا کہ اِس کام کے لیے مجھ سے زیادہ ناموزوں آدمی کسی ماں نے نہیں جنا، لیکن ''امیر المومنین'' نہیں مانے۔ طوعاً و کرہاً میں راضی ہوا تو ایک دن مجھ سے کہا گیا: حلقہ میں تقریر بھی کرنا ہوگی۔ میں گیا تو اپنی تقریر کی ابتدا میں نے یہاں سے کی کہ خواتین و حضرات، مجھ پر خدا کی اور اُس کے فرشتوں اور اہل ایمان، سب کی لعنت ہو اگر میں آپ سے ووٹ مانگنے کے لیے آیا ہوں۔ میں تو آپ کو یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ ووٹر کی حیثیت سے آپ کے فرائض کیا ہیں۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ وہ مجھے اِس الیکشن میں کسی تقریر کے لیے بلانے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔

اُن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اِسی جماعت میں گزرا۔ وہ برسوں اِس کی دعوت کے نقیب رہے۔ اِس پس منظر میں یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ جماعت جس فکر پر قائم ہے، زندگی کے اِس آخری دور میں اُس کے متعلق اُن کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ میں نے جو کچھ اُن سے سنا اور جو کچھ سمجھا ہے، اُس کی بنیاد پر میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ اب نہ وہ اقامت دین کے اُس مفہوم کے قائل تھے جو جماعت اِس سے مراد لیتی ہے، نہ اظہار دین کے وہ معنی اُن کے نزدیک درست تھے جو مولانا مودودی نے بیان



Marfat.com

کیے ہیں، نہ ''جماعت اسلامی'' قسم کی جماعتیں بنانے کو وہ صحیح سمجھتے تھے، نہ حکومت کے بغیر جہاد اور امارت اور بیعت سمع و طاعت جیسی لغویات کے لیے اُن کے فکر میں کوئی گنجایش تھی، نہ اقتدار کی سیاست کو وہ علما کے لیے موزوں خیال کرتے تھے۔ اُن کی پختہ راے اب یہی تھی کہ علما کی ہر جدوجہد کا ہدف صرف ذہنی اور فکری انقلاب ہونا چاہیے۔ عالم جب تک عالم ہے اور عالم رہنا چاہتا ہے، اِس سے آگے اُسے ہرگز کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سب باتیں اِس آخری زمانے میں اُن کی تقریروں، تحریروں اور گفتگوؤں میں بڑی صراحت کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ اِن میں سے ایک ایک چیز کے بارے میں خود اُن کے الفاظ کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔

امین احسن کی اقلیم فکر کیا ہے؟ جن لوگوں نے بھی اِس کی سیر کے لیے کچھ فرصت پائی ہے، وہ جانتے ہیں کہ مذہبیات کی دنیا میں یہ ایک بالکل نئی اقلیم ہے۔ اِس میں ساری حکومت، سارا اقتدار قرآن کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کی زبان سے جو لفظ بھی نکلتا ہے، قانون بن جاتا ہے۔ ہر جگہ اُس نے ایک میزان نصب کر رکھی ہے۔ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب اپنی اپنی چیزیں لاتے اور اِس میزان میں تولتے ہیں۔ پھر جس کی کوئی چیز ذرا بھی وزن میں کم ہو، اِس اقلیم میں وہ اُسے کہیں بیچ نہیں سکتا۔ علم و دانش، فلسفہ و حکمت، سب قرآن کے حضور میں دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ اُس کا ہر لفظ ایک شہر عجائب ہے اور یہ عجائب کبھی ختم نہیں ہوتے۔ وہ پہلے محکم بولتا اور پھر اُس کی تفصیل کر دیتا ہے۔ اُس کی باتوں کو سمجھنے



Marfat.com

میں کوئی مشکل پیش آ جائے تو خود اُسی کی دوسری باتیں وضاحت کر دیتی ہیں۔ اُس کا ایک ایوان خاص ہے جس کے بام و در پر ہر جگہ جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے کہ جو ہماری باتوں میں نظم و ترتیب کو نہیں مانتا، وہ ہمارے اِس ایوان میں داخل نہیں ہوسکتا۔ امین احسن کی ساری زندگی اِسی اقلیم میں بسر ہوئی ہے:

اُس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اُس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

تاہم ''پیران طریق'' میں بھی کبھی کوئی محرم مل ہی جاتا تھا۔ مولانا منظور احمد صاحب نعمانی لاہور آئے تو امین احسن نے اُنھیں بتایا: میری اہلیہ کہتی ہیں کہ تمھاری کتابیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں، لیکن مولانا نعمانی کی کتابیں میں خوب سمجھ لیتی ہوں۔ مولانا نعمانی نے فوراً کہا: مولانا ہم اُن کے لیے لکھتے ہیں اور آپ ہمارے لیے لکھتے ہیں۔ ''تدبر قرآن'' مکمل ہوئی تو مولانا نعمانی نے اپنا ایک خواب بیان کیا کہ وہ امین احسن کے ہاں آئے ہیں، وہاں مزعفر کی ایک دیگ پکی ہوئی ہے جس سے خوش بو کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ مولانا نعمانی نے لکھا کہ وہ اِسے ''تدبر قرآن'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

امین احسن کو اللہ تعالیٰ نے خوب صورت سراپا دیا تھا، خوش ذوق اور خوش لباس بھی تھے، لیکن اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے میں ہمیشہ بہت سادہ رہے۔ اُن کے ایک پرانے ساتھی نے بتایا کہ ''جماعت'' کی طرف سے اُنھیں میانوالی بھیجا گیا۔ میں اُن کا رفیق سفر



Marfat.com

تھا۔ ہم بس کے ذریعے سے جا رہے تھے۔ سرگودھا کے اڈے پر بس رکی تو اُنھوں نے مجھ سے کہا: گھی سمجھ کر تیل کھانے سے بہتر ہے کہ تیل سمجھ کر تیل ہی کھایا جائے، جاؤ ایک نان اور کچھ پکوڑے لے آؤ۔

وہ فرشتہ نہیں، انسان ہی تھے اور اُن میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں، لیکن معیارِ زندگی بڑھانے کا کوئی فتنہ کبھی اُن کے قریب سے نہیں گزرا۔ اللہ تعالیٰ سے تفویض و توکل کا ایسا تعلق تھا کہ اُس پر رشک آتا تھا۔ زبان اکثر ذکرِ الٰہی سے تر رہتی۔ مولانا عبدالرحیم اشرف سفرِ حج میں اُن کے ساتھ تھے، اُنھوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ وہاں پہنچ کر اُن کی ساری دل چسپی صرف بیت اللہ کے ساتھ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز سے بالکل بے تعلق ہو گئے ہیں۔ زندگی کے سرد و گرم میں ہمیشہ اپنے پروردگار کی رضا پر مطمئن رہے۔ حادثۂ قاہرہ میں ابوصالح جیسے فرزند کی وفات پر ''میثاق'' میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اُن کے جذبات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اِس موقع پر جزع فزع کا کوئی کلمہ اُن کی زبان سے نہیں نکلا۔ آخری دو سال اُنھوں نے جس معذوری اور بے بسی کی حالت میں بستر پر گزارے ہیں، اُس کی تکلیف جھیلنا آسان نہ تھا، لیکن اِس میں بھی اگر کچھ کہا تو یہی کہا کہ آخرت کی تکلیف نہ ہو تو دنیا کی کوئی تکلیف بھی تکلیف نہیں ہے۔

طبیعت میں بڑی غیرت، بڑا وقار، بڑی تمکنت اور بڑی بے نیازی تھی۔ ایوب خان صاحب نے پوچھا: مولانا، کوئی خدمت بتایئے۔ اُن کا جواب تھا: آپ سے جو



Marfat.com

کچھ کہنا ہوتا ہے، ''میثاق'' کے اداریوں میں کہہ دیتا ہوں، اُس پر عمل کیجیے، یہی سب سے بڑی خدمت ہے۔ بھٹو صاحب نے پیغام بھیجا کہ حکومت آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ جواب دیا: میں حکومت کے وظیفہ خواروں کو ہمیشہ ملت فروش کہتا رہا ہوں۔ کیا اب خود بھی یہی کام کروں گا؟ ضیاء الحق صاحب کی طرف سے سلسلہ جنبانی ہوئی، لیکن اگر کچھ کہا تو صرف یہی کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، اُسے اپنی لائبریریوں تک پہنچایئے، یہی کافی ہے۔ اُن کی ہر ادا میں یہ صدا تھی:

مگذر از نغمۂ شوقم کہ بیابی در وے
رمز درویشی و سرمایۂ شاہنشاہی

دوستوں کے لیے، البتہ طبیعت میں بڑی تواضع اور بڑی شفقت تھی۔ جن دنوں رحمٰن آباد میں تھے، میں ایک مرتبہ ملنے کے لیے گیا تو رات وہیں ٹھیرا۔ فجر سے کچھ پہلے میں نے محسوس کیا کہ ذرا دور کوئی ہاتھ کے نل سے پانی کی بالٹی بھرتا اور پھر اُسے انڈیل دیتا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ امین احسن ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میری چارپائی کے پاس آئے اور فرمایا: میں نے تازہ پانی نکال دیا ہے، اٹھیے اور وضو کر لیجیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں اور کیا کروں۔

وہ اتنے سچے، اتنے بے لاگ اور اتنے دوٹوک تھے کہ مصلحت اندیشی کے پیمانے سے اُسے خطرناک سمجھا جائے گا۔ جو کچھ کہنا چاہتے، بغیر کسی تردد کے کہہ دیتے۔ اپنے رفقا میں فکر و عمل کا کوئی تضاد کسی حال میں برداشت نہ کرتے۔ اُن کی محبت بے پناہ تھی،



Marfat.com

مگر اخلاص کی گہرائی سے جس طرح یہ محبت چشمہ بن کر پھوٹتی تھی، اِسی طرح رنج بھی ابل پڑتا تھا۔ تاہم دیکھنے والے دیکھتے کہ اِس میں کسی بغض، کسی کینے اور کسی دشمنی کا کوئی شائبہ نہ ہوتا۔ گویا وہی معاملہ تھا کہ:

قہر بھی اُس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

اُن کی باتیں کہاں تک لکھوں؟ آج اُن کا مرقع کھینچ رہا ہوں تو اپنے عجز بیان کو دیکھ کر بار بار خیال ہوتا ہے کہ امین احسن سے کم و بیش پچیس سال تک ملاقات اور تلمذ کا جو شرف مجھے حاصل رہا ہے، اے کاش، کسی ایسے شخص کو بھی حاصل ہوتا جسے زبان و بیان پر امین احسن ہی کی طرح قدرت ہوتی۔ یہ زمانے کی بدقسمتی ہے کہ اِس نابغۂ روزگار کو جاننے کے لیے اُسے مجھ جیسا شکستہ قلم ہی میسر ہو سکا جس کا حال یہ ہے کہ:

در زباں حرف نماندہ ست وسخنہا ماندہ ست

وہ صرف دین ہی کے عالم نہ تھے، دستور و قانون اور سیاست دوراں کے مسائل پر بھی اُن کی نظر اتنی گہری تھی کہ اِن کے ماہرین اُن کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔ اِن چیزوں کو دیکھنے کا اُن کا اپنا ایک انداز تھا جو اہل زمانہ سے بہت کچھ مختلف تھا۔ بھٹو صاحب کو پھانسی کی سزا ہوئی تو مذہبی حلقوں میں بالعموم اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اِس سے اگلے روز میں رحمٰن آباد حاضر ہوا تو امین احسن کو افسردہ دیکھا۔ میں نے پوچھا تو کچھ دیر کے لیے خاموش رہے، پھر فرمایا: مجھے بھٹو صاحب سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے، لیکن جن احمقوں نے ایک قومی رہنما کو ختم کر دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے،



Marfat.com

وہ نہیں جانتے کہ اِس طرح اُنھوں نے اِس ملک کی سیاست میں ایک مستقل عناد کی بنیاد رکھ دی ہے۔ افغانستان میں جو کچھ ہوا، اُس کے مضمرات اُنھوں نے جس طرح ابتدا ہی میں سمجھ لیے تھے، اُسے آج لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ الجزائر، ترکی اور مصر وشام میں اسلامی تحریکوں کے معاملات کو وہ جس نظر سے دیکھتے تھے، ہمارے مذہبی رہنما شاید اُس وقت دیکھیں گے، جب بہت کچھ ڈوب چکا ہو گا۔ جماعت اسلامی سے اُن کی علیحدگی جس موقف کی بنیاد پر ہوئی، وہ اب اپنی صحت کے لیے کسی بحث واستدلال کا محتاج نہیں رہا۔ اِس کی اصابت خود اُن لوگوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دی ہے جو اِس وقت مولانا مودودی کے مشیروں میں اُن کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سن لیا ہے کہ اپنے امیر سے وہ آج وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو آج سے برسوں پہلے امین احسن نے اُن کے ''امیر المومنین'' سے کہا تھا۔

وہ ایک زندہ انسان تھے اور زندگی کے مسائل کو ایک زندہ اور بیدار انسان جس طرح دیکھتا ہے، اُسی طرح دیکھتے تھے۔ علم وعمل کے جس مرتبے پر وہ فائز تھے، وہاں کھیل تماشے کا کیا گزر؟ لیکن ملک سے اُن کی محبت کا یہ عالم تھا کہ پاکستان اور بھارت اگر کبھی میدان میں اترتے تو بار بار پوچھتے اور اُس وقت تک مطمئن نہ ہوتے، جب تک پاکستان کی فتح کا یقین نہ ہو جاتا۔ غالب، اقبال اور شبلی کے بڑے مداح تھے۔ اُن کے اشعار اکثر پڑھتے۔ طبیعت میں شگفتگی تھی، اپنی بیماری کا ذکر بھی کرتے تو



Marfat.com

لب ولہجہ ایسا ہوتا کہ چہروں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ مذہبی حماقتوں پر اُن کی خاص نظر رہتی تھی، یہ ذکر چھڑ جاتا تو اُن کی گل افشانی گفتار کا عالم دیکھنے کی چیز ہوتا۔ لفظ لفظ میں تلمیح وتعریض سے وہ مضمون پیدا کرتے کہ سننے والا صاحب ذوق ہوتا تو اش اش کر اٹھتا۔ اُن کے پرانے دوستوں میں سے ایک مذہبی رہنما سے اِسی طرح کی بعض باتیں سرزد ہوئیں تو اُن پر تبصرے کے لیے ایسے خوب صورت اسالیب ایجاد کیے کہ خوف فساد خلق نہ ہوتا تو میں سناتا اور لوگ دیکھتے کہ امین احسن کو قدرت نے لفظ و معنی کو رشتہ بپا کرنے کی کیا صلاحیت بخشی تھی اور کس کمال سے نوازا تھا۔ وہ دنیا سے کیا گئے، حقیقت یہ ہے کہ:

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

حالی غالب کے شاگرد تھے۔ اُن کے مرثیے کا اختتام اُنھوں نے جن شعروں پر کیا ہے، اُنھیں لوگوں نے اُس زمانے میں حالی کے حسن عقیدت پر محمول کیا ہوگا۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ غالب وہی تھا، جسے حالی کی آنکھوں نے دیکھا۔ میں نے بھی بہت عالم دیکھے، بہتوں کو پڑھا اور بہتوں کو سنا ہے، لیکن امین احسن اور اُن کے استاذ حمید الدین فراہی کا معاملہ وہی ہے کہ:

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت!
خاک کو آسماں سے کیا نسبت!

[۱۹۹۷ء]



Marfat.com

# دیدۂ صورت پرست ماست

یہ ربیع الاول کا مہینا ہے۔ اِس مہینے میں وہ ہستی عالم وجود میں آئی جسے خود عالم کے پروردگار نے رحمۃ للعلمین قرار دیا۔ جس کی پوشاک اور جس کی ران پر ابن مریم نے دیکھا کہ اُس کا ایک نام لکھا ہوا ہے: خداوندوں کا خداوند اور بادشاہوں کا بادشاہ؛ وہ جو قیامت تک کے لیے سرور عالم ہے؛ جس کا قلم روز زمین کے سارے کناروں تک پھیلا ہوا ہے؛ جسے جوامع الکلم عطا ہوئے؛ جس کے لیے ساری زمین مسجد بنادی گئی؛ جس کی ہیبت سے کفر لرزہ براندام ہوا؛ جسے میزان عطا ہوئی اور اِس کے ساتھ لوہا بھی کہ وہ اِس کے ذریعے سے لوگوں پر خدا کی حجت پوری کر دے؛ جس پر نبوت ختم ہوئی؛ قرآن نازل ہوا اور جس کے بارے میں یہ فیصلہ لوح گیتی پر ثبت کر دیا گیا کہ صبح نشور تک اب خدا کی غیر متبدل ہدایت اُس کی لائی ہوئی کتاب کے سوا کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتی۔

وہ ہستی اِسی مہینے میں منصۂ عالم پر جلوہ فرما ہوئی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اُس کی نسبت سے یہ مہینا رشک دہر ہے اور جی چاہتا ہے کہ اِس کا ایک ایک لمحہ جشن مسرت میں بسر ہو، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ صدیق و فاروق، عثمان و حیدر اور بلال و بوذر نے، جن کی اِس



Marfat.com

ہستی سے محبت وعقیدت کا سرمایہ ہی اُن کا اثاث البیت تھا، نہ اِس ماہ کو "ماہ جشن" بنایا اور نہ اِس دن کو "عید میلاد" قرار دیا جس کی صبح درخشاں میں یہ دعائے خلیل اور نوید مسیحا پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہوئی۔ وہ دنیا میں تھے تو یہ دن بارہا طلوع ہوا اور یہ مہینا بارہا آیا، مگر اُن کے شب وروز کا دریا اپنے راستے پر بہتا رہا۔ آسمان کی آنکھوں نے لمحہ بھر کے لیے بھی اُس میں کوئی تموج نہیں دیکھا۔ یاللعجب، یہ ماجرا کیا ہے؟

"یوم اقبال"، "یوم جناح" ــــ اِس ہستی کے مقابلے میں یہ لوگ ہی کیا تھے، لیکن اِن کے مداح اگر اِن کے یوم پیدائش پر یہ اہتمام کرسکتے ہیں تو اِس دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل کے لیے کیوں نہیں، جس نے:

غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

میں برسوں اِس خلجان میں مبتلا رہا، مگر للہ الحمد کہ بالآخر یہ عقدہ حل ہوا۔ حقیقت نمایاں ہوئی تو یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ہمارے فکر کی ساری نارسائیاں درحقیقت ہمارے زاویۂ نگاہ سے پیدا ہوتی ہیں:

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

بات دراصل یہ ہوئی کہ ہم نے اُسے سب سے بڑا تو مانا، مگر اُنھی شخصیتوں کے زمرے سے مانا جن سے ہم مانوس تھے اور وہ اِس زمرے کا شخص ہی نہ تھا۔ چنانچہ یہ اِسی کا نتیجہ تھا کہ زمین پر سارے دن اُس کے تھے، مگر ہمارے لیے وہ ایک خاص دن



Marfat.com

میں پیدا ہوا؛ وہ ہر مہینے کا ماہ تاباں تھا، مگر ہم نے اُسے جب دیکھا، ربیع الاول ہی کے مطلع پر دیکھا؛ تقویم خداوندی میں ہر سال اُسی کے نام سے معنون تھا، مگر ہماری تقویم میں اُس کا یوم ولادت ۵۷۰ بعد مسیح ہوا:

جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

ہم نے چاہا کہ ہم سمندر کو کنوئیں میں بند کریں، صحرا کو صحن میں اتاریں اور آسمان کو ردا بنائیں، لیکن وہ جو اُس کے ساتھی تھے ـــــ صدیق وفاروق، عثمان وحیدر، بلال وبوذر ـــــ اُنھوں نے سمندر کو سمندر، صحرا کو صحرا اور آسمان کو آسمان دیکھا، تب اُن پر واضح ہوا کہ وہ جس کی یاد کی شمعیں ہر دل میں فروزاں رہنی چاہییں اور جس کا نام جب دن پہلو بدلے، ہر مسجد کے مناروں سے بلند ہونا چاہیے، یہ اُس کی شان سے فروتر ہے کہ اُسے ایک یوم میلاد اور ایک ماہ ربیع الاول کی شخصیت بنایا جائے۔ وہ عزیز از جاں اور عزیز جہاں ایک دن اور ایک مہینے کی شخصیت نہیں ہوسکتا۔ وہ تو ہر دن، ہر مہینے اور ہر سال کی شخصیت ہے، اِس لیے نہ ''عید میلاد النبی'' نہ ''جشن ربیع الاوّل''، بلکہ صبح دم، دن ڈھلے، لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ، ایک ہی صدا اور ایک ہی نغمہ: 'أشهد أن لا إله إلّا الله، أشهد أن محمدًا رسول الله'۔

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ

[۱۹۹۰ء]



Marfat.com

# دینی و لا دینی

یہ سولھویں صدی کا وسط تھا، جب مغرب میں وہ جنگ شروع ہوئی جس نے بالآخر پوپ کی مقدس پادشاہی کا خاتمہ کر دیا۔ اِس پادشاہی میں وہ خدا کا نائب تھا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ زمین پر وہ جو کچھ جوڑ دیتا ہے، وہ آسمان پر بھی باقی رہتا ہے۔ اُس پر وہ زمانہ بھی گزر چکا تھا، جب شہنشاہ روما ہنری چہارم تین دن اور تین راتیں برہنہ سر اور برہنہ پا اطالیہ کے اُس قلعے کے دروازے پر پڑا عاجزی کرتا اور معافی مانگتا رہا جس میں پاپائے اعظم مقیم تھا، لیکن اُس نے دروازہ نہیں کھولا۔ پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی کی ابتدا میں مارٹن لوتھر نے اُس کے اقتدار کو چیلنج کیا، ایراسمس (Erasmus)، کال ون (Calvin)، اور زونگلی (Zwingly) نے یورپ کے دوسرے علاقوں میں اِس تحریک کو آگے بڑھایا۔ اِس کے نتیجے میں ایک عظیم جنگ برپا ہوئی۔ عوام نے اِس جنگ میں مصلحین کا ساتھ دیا۔ چنانچہ پوپ نے ہزیمت اٹھائی اور اُس کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

مغرب میں علوم کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی تحریک اِسی فتح کے نتیجے میں عروج کو پہنچی۔ اِس تحریک کے فتوحات بے مثال ہیں؛ اِس نے فطرت کے بے شمار



Marfat.com

حقائق بے نقاب کیے ہیں؛ انسان کے لیے بے حد و حساب سہولتیں پیدا کی ہیں؛ اُس کی حکومت بحروبر پر قائم کر دی ہے؛ اُسے ثریا کی خبر لانے اور ثریٰ میں اترنے کے قابل بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی غیر معمولی کامیابیوں پر خود انسان حیران ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ عالم طبیعیات حیرت انگیز حد تک اُس کی گرفت میں ہے اور اُس کے خواب حقیقت میں بدل گئے ہیں۔

پوپ کے خلاف یہ جنگ اور نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک، دونوں انسان کا مایۂ افتخار ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ پوپ کا دعویٰ باطل تھا۔ دین حق میں کبھی کوئی پوپ اور کوئی پادری خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان حائل نہیں رہا۔ یہ دعویٰ ہر حال میں باطل قرار پانا چاہیے تھا۔ جن لوگوں نے اِسے باطل قرار دیا، اُنھوں نے بے شک ایک حق کا اثبات کیا۔ یہی معاملہ نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا ہے۔ علم انسان کی سب سے بڑی متاع ہے۔ اُس کی بازیافت اور دریافت کے لیے جو سعی بھی کی جائے گی، اُسے یقیناً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ لیکن انسان کی بدقسمتی ہے کہ اِس جنگ اور اِس تحریک میں ردعمل کی نفسیات نے صرف پوپ کو رد نہیں کیا، اِس کے ساتھ کائنات کی اِس سب سے بڑی حقیقت کو بھی رد کر دیا ہے کہ انسان اِس زمین پر خدا کی مخلوق اور اپنے تمام معاملات میں اُس کے حکم کا تابع اور اُس کے سامنے جواب دہ ہے۔

یہ حقیقت کسی دلیل کی بنا پر رد نہیں ہوئی۔ چار صدیاں گزر چکی ہیں۔ اِس موضوع پر مغرب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس کا دقت نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ہم پورے



Marfat.com

وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اِسے اندھے تعصب اور بے لگام جذبۂ نفرت نے رد کیا ہے۔ قلم نے اِس باب میں جو کچھ لکھا اور زبان نے جو کچھ کہا ہے، وہ انسان کے لیے باعث شرم ہے۔ علم واستدلال کے دور میں جہالت روا رکھی گئی۔ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہنے والوں نے حقیقت سے روگردانی کی۔ علم کی پرستش کرنے والوں نے علم کو رد کر دیا۔ یہ اِس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اِس پر اگر زمین روئے اور آسمان ماتم کرے تو کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے۔

[۱۹۸۷ء]

# نیا فتنہ

مغرب میں قافلۂ سیاست ومعیشت نے اپنے سفر کی ابتدا دریاؤں کے کنارے آباد نئے تجارتی شہروں سے کی تھی۔ یہ شہر اُن دیہات سے زیادہ دور نہیں تھے، جہاں ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیردار دادِ عیش دیتے اور اربابِ کلیسا کی پناہ گاہوں کے کلس فلک الافلاک کی خبر لاتے تھے۔ یہ سترھویں صدی کا آغاز تھا اور اب بیسویں صدی اپنے ربع آخر میں ہے۔ اِس سفر میں بعض بڑے سخت مقام آئے ہیں۔ روح اہرمن نے نئے قالب تلاش کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ قرونِ مظلمہ کے قبا پوش جاگیردار اب دورِ حاضر کے



Marfat.com

سگار بدست تاجر اور صنعت کار ہیں۔ سرمایہ کے خلاف محنت کی جدو جہد تاریخ کے عجائب گھر میں عبرت کا مجسمہ بن چکی ہے۔ یہ کارواں اِس صدی کی ابتدا میں جس منزل تک پہنچا تھا، وہاں آدم کا بیٹا دونیم ہوگیا ہے۔ اُس کا دماغ کریملن کے حفاظت خانوں میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور اُس کا جسم ریاست کے لنگر خانوں میں ارتقا کے منازل طے کر رہا ہے۔ دوسری طرف یورپ کے تجارتی شہر وجود بشر کے دل و دماغ بن گئے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے دیہات کی دولت بادشاہ کو وجود میں لاتی تھی، اور بادشاہ دہ خداؤں کی پشت پناہی کرتا تھا۔ نئے شہروں کا سرمایہ پارلیمان کو جنم دیتا ہے اور پارلیمان اُس کی حفاظت کرتی ہے۔ ارتکاز دولت کی کرشمہ سازیاں جسد انسانیت میں بدروح کی طرح حلول کر گئی ہیں۔ کریملن کی سنگین دیواروں اور نیویارک کی فلک بوس عمارتوں پر اِسی آسیب کا قبضہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اِس نے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا اور یہاں کے حکمرانوں کی زبان پر اِس کا حکم جاری ہے۔ پوپ اطالیہ کے گوشۂ عافیت میں آرام کر رہا ہے۔ اُس کے محل کا کلس اب بھی فلک آشنا ہے، لیکن مغرب جدید کے بلاد عالیہ میں:

گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

مشرق ایک طویل عرصے تک اِس سیلاب کی گزرگاہ رہا ہے۔ ہمالہ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اُس کی تباہ کاریوں کے



Marfat.com

آ ثار نمایاں ہیں۔ پانی اتر چکا ہے، لیکن اپنے پیچھے نشیب وفراز چھوڑ گیا ہے۔ مورخ کا قلم اِس کی داستان سفر رقم کرے گا تو عبرت وحیرت کا ایک جہان وجود میں آئے گا۔ تین صدیوں کے ہمہ گیر غلبہ واستیلا کے بعد یہ عفریت اپنے گھر لوٹ آیا ہے، لیکن اِس کے پہلو سے ایک نیا فتنہ جنم لے چکا ہے۔ ہمالہ کی دیوار کو یاجوج وماجوج چاٹ رہے ہیں، اور خدا کے بندے ایک مرتبہ پھر تاریخ کے محشر میں کھڑے ہیں۔

[۱۹۷۹ء]



Marfat.com

# دین و دانش

Marfat.com

Marfat.com

# ایمان بالغیب

ایمان بالغیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے، اُنھیں انسان محض عقلی دلائل کی بنا پر مان لے۔ ذات خداوندی کو ہم دیکھ نہیں سکتے؛ قیامت ابھی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جبریل امین کو وحی کرتے ہم نے نہیں دیکھا، لیکن اِس کے باوجود ہم اِن سب باتوں کو مانتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن حقائق کو ماننے کے لیے انفس و آفاق میں اور خود اُس کلام میں جو اللہ کے پیغمبر نے پیش کیا، ایسے قوی دلائل موجود ہیں جن کا انکار کوئی صاحب عقل نہیں کرسکتا۔

چنانچہ ہم اِنھیں بے سوچے سمجھے نہیں مانتے، بن دیکھے مانتے ہیں۔ وہ چیز جو دیکھی نہیں جا سکتی، لیکن عقل کے ذریعے سے سمجھی جا سکتی ہے، اُسے دیکھنے کا تقاضا ہی سب سے بڑی بے عقلی ہے۔ کتنی حقیقتیں اِس زمانے میں سائنس نے دریافت کی ہیں جنھیں ہم اپنے حواس کی گرفت میں نہیں لے سکتے، لیکن اِس کے باوجود اِسی طرح مانتے



Marfat.com

ہیں، جس طرح دوپہر چڑھے کھلے آسمان کے نیچے اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ سورج چمک رہا ہے اور اِس کی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

قرآن نے جو حقائق پیش کیے ہیں، اُن پر ہمارے ایمان کی بنیاد بھی یہی ہے۔ وہ، بے شک حواس سے ماورا ہیں، لیکن عقل سے ماورا نہیں ہیں۔ ہم نے اُنھیں عقل کی میزان میں تولا ہے اور اُن میں رتی بھر کمی نہیں پائی۔ چنانچہ ہم اُن پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُنھیں عقل وفطرت کے قطعی دلائل کی بنا پر مانتے ہیں۔ اِس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد ہی مانیں گے۔

[۱۹۸۷ء]

# اضطراری علم

علم کو بدیہی اور نظری میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پھر بدیہی اُسے قرار دیا جاتا ہے جو فکر و تدبر کے بغیر آپ سے آپ حاصل ہوتا ہے اور نظری اُسے جس کا فکر و تدبر کے ذریعے سے خود بدیہی سے اکتساب کیا جاتا ہے۔ اِس تقسیم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بدیہی اصل اور اساس کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور باقی ہر چیز اُس کی فرع قرار پاتی ہے۔ فلسفہ کی



Marfat.com

ابتدا خارجی حقائق سے متعلق بحث و تمحیص سے ہوئی تھی۔ پھر مدارک کی حقیقت موضوع بحث بنی اور بدیہی کو اصل قرار دیا گیا تو اُس کی علامت یہ سمجھی گئی کہ اُس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوتا، مگر انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز سے اختلاف کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا اور ظنون وشبہات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایک فریق کا اصرار ہے کہ معلوم صرف محسوس ہے اور وہی اصل ہے۔ تمام افکار و خیالات اُس چیز سے پیدا ہوتے ہیں جسے ہم اپنے حواس کی مدد سے سمجھتے ہیں۔ دماغ (tabula rasa)، یعنی لوح سادہ ہے۔ ہمارے ادراک سے پہلے کوئی چیز اُس پر ثبت نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہتا ہے کہ علم واردات نفس ہیں اور نفس مدرکہ کے سوا ہم کسی موجود کے وجود کا یقین نہیں رکھتے۔ تیسرے کا دعویٰ ہے کہ اثر محسوس کے سوا کوئی چیز یقینی نہیں ہے اور چوتھے نے اعلان کر رکھا ہے کہ حس اور فکر، دونوں ناقابل اعتماد ہیں، اِس لیے دنیا میں یقین اور قطعیت نام کی کوئی چیز سرے سے پائی ہی نہیں جاتی۔

اِس کا نتیجہ کیا ہے؟ پہلے فریق نے عقل، روح، اللہ اور معاد کا انکار کر دیا ہے؛ دوسرا اِس عالم محسوس کو نہیں مانتا؛ تیسرا دونوں کا منکر ہے اور علم محض کے سوا کسی چیز کا اثبات نہیں کرتا؛ چوتھے نے علی الاطلاق علم اور یقین کی نفی کر دی ہے، وہ اِن میں سے کسی چیز کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دیکارت (Descartes) نے جب یہ کہا تھا کہ ''میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں''، تو سقراط وفلاطوں کے بعد ایک مرتبہ پھر علم و تفلسف کو اِسی تشکیک سے نکالنے کی کوشش کی تھی*۔ دور ما بعد جدیدیت میں یہی



Marfat.com

سوفسطائیت زبان کی تحلیل کے ذریعے سے اپنا مدعا ثابت کرنا چاہتی ہے۔ اِس کا کہنا ہے کہ کوئی علامت یا کوئی لفظ (signifier) بھی کسی متعین شے (signified) کے معنی بیان نہیں کرتا، اِس لیے کہ کسی متعین شے کا کوئی حتمی وجود نہیں ہے۔ ہر لفظ کے معنی جملے میں موجود دوسرے الفاظ کے سہارے متعین کیے جاتے ہیں۔ آپ ایک لفظ کا اضافہ کر دیجیے یا ایک لفظ کم کر دیجیے تو پورے جملے کے معنی تبدیل ہو جائیں گے۔ چنانچہ معنی نہ الفاظ میں ہیں نہ جملوں میں، وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔ جملے میں کوئی لفظ بھی پوری طرح معنی کا متحمل نہیں ہوتا، لہٰذا وہ دوسرے لفظ یا الفاظ تک معنی کو ملتوی (defer) کر دیتا ہے۔ اِسی طرح مختلف الفاظ کے سہارے معنی اپنا رخ متعین کرتے ہیں، عبارت کا سیاق اُنھیں برابر بدلتا رہتا ہے، وہ کبھی قطعی اور حتمی نہیں ہوتے۔ چنانچہ اُن سے وابستہ اقدار بھی بے معنی ہیں، وہ بھی حتمی نہیں ہو سکتیں**۔ وحی الٰہی کی رہنمائی کے

* 'Cogito ergo sum'۔ دیکارت کی یہ کوشش بھی فیصلہ کن نہیں ہو سکی، اِس لیے کہ اِس میں بھی فطرت انسانی کے اندر بدیہیات کی اصل اور اساس کو بنائے استدلال نہیں بنایا گیا۔ چنانچہ ژاک دریدا (Jaques Derrida) سب سے پہلے وجود کی مابعد الطبیعیاتی حیثیت پر قائم اِسی روایت کو ہدف تنقید بناتا اور اِس بات پر اصرار کرتا ہے کہ خود 'میرا وجود' بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اِس لیے کہ اُس کے بھی کوئی قطعی معنی نہیں ہیں۔

** اِس نقطۂ نظر کے حاملین اِس بات پر غور نہیں کرتے کہ اُن کا یہ استدلال بجائے خود نظر و استدلال کی صحت پر اُن کے یقین کا اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یقین کا ابطال بھی اُس سے بالاتر کسی دوسرے یقین کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انسان کا اضطرار ہے۔ چنانچہ ابطال کی ہر



Marfat.com

بغیر جو لوگ حقیقت کی تلاش میں نکلے تھے، اُن کی روداد سفر یہی ہے۔ اقبال نے غلط نہیں کہا تھا:

ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

قرآن اِس کے برخلاف اپنے استدلال کی بنیاد اُس فطری علم پر رکھتا ہے جو نفس انسانی میں الہام کر دیا گیا ہے۔ انسان کے تمام علم و عمل اور فکر و استدلال کی بنیاد درحقیقت یہی علم ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑتی ہے، وہ بدیہی ہے، لہٰذا اِسی کو اصل مان کر انسان اپنی جستجو شروع کرتا ہے۔ اُسے توجہ نہیں ہوتی کہ یہ حقیقت میں اُس کا فطری علم ہے جو اُسے بدیہیات تک پہنچاتا اور ہانکتا ہوا نظریات تک لے جاتا ہے۔ یہ علم نہ ہوتا تو بداہت، نظر، استدلال، اِن میں سے کوئی چیز بھی وجود پذیر نہیں ہو سکتی تھی، اِس لیے کہ خارج سے جو چیز آتی ہے، وہ صرف موضوعات ہیں۔ اُن کا حکم خارج سے نہیں آتا، وہ نفس کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ وہی یہ حکم لگاتا اور بارہا موضوعات کو نئے موضوعات میں تبدیل کر دیتا ہے تاکہ اُن پر نیا حکم لگائے۔ ذوق و ادراک اِسی کا ظہور ہے جس میں سے پہلا عمل اور دوسرا علم

---

کوشش کا نتیجہ احقاق ہوتا ہے، لیکن انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ شدت جذبات میں گریز کر کے گزر جاتا ہے۔ شخصی آزادی اور انفرادیت جس کے لیے یہ حضرات مرے جاتے ہیں، وہ بھی ایک قدر ہے اور تمام اقدار کی نفی پر اصرار سے بھی اِس کے سوا کچھ مقصود نہیں کہ اُس سے پھر ایک قدر کا اثبات کیا جائے۔ گویا وہی صورت حال ہے کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔



Marfat.com

کا مصدر ہے۔ ذات وصفات، حامل ومحمول، فعل وانفعال، حسن وقبح، مدرک اور غیر مدرک اور ذات اور اُس کے عوارض میں فرق وامتیاز کا منبع بھی یہی ہے۔ حواس کے ذریعے سے جو اثرات نفس انسانی تک پہنچتے ہیں، اُن سے موثرات پر استدلال اِسی کا وظیفہ ہے جس سے وجود خارجی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ انسان جب تک انسان ہے، اِس کے فیصلوں کا انکار نہیں کرسکتا۔ نفس انسانی پر اِس کی حکومت قائم ہے۔ لہٰذا یہ تسلیم و انقیاد کوئی اختیاری چیز نہیں ہے، وہ مجبور ہے کہ اِس علم کے فیصلوں کو اُسی طرح تسلیم کرے، جس طرح وہ اپنی جبلتوں کے تقاضے تسلیم کرتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ انسان ہر چیز کا انکار کرسکتا ہے تو اِس کا کیوں نہیں کرسکتا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ زبان سے یقیناً کرسکتا ہے، مگر جس وقت کرتا ہے، عین اُسی وقت اُس کا عمل، اُس کے اعضا و جوارح اور اُس کے احوال اُس کی تکذیب کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہر سلیم الطبع شخص پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ صریح مکابرت ہے۔ امام حمید الدین فراہی نے اِسی بنا پر اِسے علم اضطراری سے تعبیر کیا اور بالکل درست فرمایا ہے کہ نفس انسانی میں ایک مہبط الہام ہے، اِسے مرکز کہنا چاہیے۔ اِس سے علم کا وہ دائرہ وجود میں آتا ہے جسے ہم فطری کہیں گے۔ اِس کے بعد بدیہی اور نظری ہے۔ چنانچہ علم کی تقسیم محض بدیہی اور نظری میں نہیں، بلکہ جذری، فطری، بدیہی اور نظری میں ہونی چاہیے، کیونکہ یہی حقیقت ہے۔

اِس روشنی میں دیکھیے:

قرآن بتاتا ہے کہ خالق کا اقرار مخلوقات کی فطرت ہے۔ وہ اپنے وجود ہی سے



Marfat.com

تقاضا کرتی ہیں کہ خالق کی محتاج ہیں۔ اُن کے لیے خالق کا اثبات پیش نظر ہو تو کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی، صرف متنبہ کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی مخلوق اپنے خالق کا انکار نہیں کرتی، بلکہ توجہ دلائی جائے تو اُس کو ماننے کے لیے اِس طرح لپکتی ہے، جس طرح پیاسا پانی کے لیے لپکتا ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ بنی آدم سے جب خدا نے پوچھا تھا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں تو سب نے ایک ہی جواب دیا تھا کہ ہاں، آپ ضرور ہمارے رب ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ حیات دنیوی میں انسان بعض اوقات انکار کر دیتا ہے۔ یہ محض مکابرت ہے۔ لہٰذا جس وقت انکار کرتا ہے، عین اُسی وقت اپنے دائرۂ علم میں ہر انفعال کے لیے فاعل، ہر ارادے کے لیے مرید، ہر صفت کے لیے موصوف، ہر اثر کے لیے موثر اور ہر نظم کے لیے ایک علیم و حکیم ناظم کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے۔ اُس کا تمام علم اِسی سرگردانی کی سرگذشت ہے۔ یہ عمل کی تکذیب ہے جو اُس کے انکار کی حقیقت بالکل آخری درجے میں واضح کر دیتی ہے۔

یہی معاملہ خیر و شر کے شعور کا ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی نفس انسانی میں الہام کر دیا گیا ہے۔ مگر انسان بعض اوقات انکار کرتا ہے۔ اِسے بھی مکابرت کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا، اِس لیے کہ جس وقت انکار کرتا ہے، عین اُسی وقت خود اُس کو برائی کا ہدف بنا لیا جائے تو بغیر کسی تردد کے برائی کو برائی ٹھیراتا اور اُس کے خلاف



Marfat.com

سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں، نیکی کی جائے تو اُس کے لیے عزت واحترام کے جذبات ظاہر کرتا اور اپنے لیے جب بھی کوئی معاشرت پیدا کرتا ہے تو اُس میں حق و انصاف کے لیے لازماً کوئی نظام قائم کرتا ہے۔ اُس کا قانون، عدالتیں اور بین الاقوامی ادارے، سب اِسی حقیقت کی گواہی دیتے ہیں۔

الفاظ کی دلالت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ وہ میزان، فرقان اور فصل نزاعات کے لیے حکم کی حیثیت سے نازل ہوا ہے اور اُس نے اپنی بات اِس قطعیت کے ساتھ پہنچادی ہے کہ اُس کی بنیاد پر روز قیامت انسان مسئول ہوں گے اور اُن کے لیے جنت اور جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ قرآن کا یہ ارشاد اُس فطری یقین پر مبنی ہے جو انسان کو نطق و بیان کی صلاحیت اور اُس کے ذریعے سے ابلاغ کی قطعیت پر ہمیشہ سے رہا ہے۔ ائمۂ فقہ وحدیث ایک مسلمہ قاعدے کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں کہ 'ماثبت بالکتاب قطعی موجب للعلم والعمل'۔ فلسفے کے زیغ و ضلال سے متاثر متکلمین، البتہ نہیں مانتے۔ اُن کا اصرار ہے کہ الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر ظنی ہوتی ہے، اِس لیے قرآن کے الفاظ نہیں، بلکہ عقلی براہین حق و باطل کے لیے کسوٹی ہیں*۔ یہ بھی، اگر غور کیجیے تو صریح مکابرت ہے، اِس لیے کہ وہ جس

* دور مابعد جدیدیت کے مفکرین یقین کی یہ بنیاد بھی انسان سے چھین لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اِس کے بعد بے معنویت اور اتھاہ بے یقینی کے سوا انسان کے پاس کیا باقی رہ جائے گا اور اُس کے آلام اِس کے نتیجے میں کہاں پہنچیں گے، اِس کا کسی کو اندازہ نہیں ہے۔



Marfat.com

وقت یہ کہتے ہیں، عین اُسی وقت اپنا یہ نقطۂ نظر اُنھی الفاظ کے ذریعے سے بیان کر رہے ہوتے ہیں اور اُنھیں ادنیٰ تردد بھی نہیں ہوتا کہ اُن کی بات اُن کے مخاطبین تک پوری قطعیت کے ساتھ نہیں پہنچے گی۔ پھر یہی نہیں، دوسروں کو سنتے اور اُن کی لکھی ہوئی تحریریں پڑھتے ہوئے بھی اُنھیں اِس طرح کا کوئی تردد کبھی لاحق نہیں ہوتا۔ بحث و مباحثہ کی نوبت آ جائے تو اُن کا ایک ایک لفظ اِس کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ نفس انسانی پر نفس انسانی کی شہادت ہے جس سے بڑی کوئی شہادت نہیں ہو سکتی: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ، وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ۔*

ابن قیم لکھتے ہیں:

من ادعى أنه لا طريق لنا إلى اليقين بمراد المتكلم، لأن العلم بمراده موقوف على العلم بإنتفاء عشرة أشياء فهو ملبوس عليه ملبس على الناس؛ فإن هذا لو صح لم يحصل

''جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے لیے پورے یقین کے ساتھ متکلم کے منشا تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اور اُس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اُس کے منشا کا علم اِس چیز پر موقوف ہے کہ پہلے دس چیزوں کی نفی کی جائے،** وہ خود بھی الجھاؤ میں ہیں

---

* القیامہ ۷۵: ۱۴-۱۵۔ ''انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ کتنے ہی بہانے بنائے۔''

** یعنی اشتراک، مجاز، نقل، اجمال، تخصیص اور معارض عقلی وغیرہ۔ اِس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: شرح المواقف، الجرجانی ۲/۵۱۔



Marfat.com

لأحد العلم بكلام المتكلم قط، وبطلت فائدة التخاطب، وانتفت خاصية الانسان، وصار الناس كالبهائم، بل أسوأ حالاً، ولما علم غرض هذا المصنف من تصنيفه، وهذا باطل بضرورة الحس والعقل، وبطلانه من أكثر من ثلاثين وجهًا مذكورة فی غير هذا الموضع.

(اعلام الموقعین ۱۰۹/۳)

اور دوسروں کو بھی الجھاؤ میں ڈالنا چاہتے ہیں، اِس لیے کہ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو متکلم کے کلام کا علم کبھی حاصل نہ ہوتا، مخاطبت بے معنی ہو جاتی، بلکہ انسان اپنے انسان ہونے کی خاصیت کھو بیٹھتا اور لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتے۔ یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اِس مصنف کا مقصد کیا ہے جو یہ اپنی تصنیف سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ عقل اور حس، دونوں کا فیصلہ ہے کہ یہ دعویٰ بالضرور باطل ہے۔ اِس کے ابطال کے تیس سے زیادہ وجوہ ہیں جو دوسری جگہ مذکور ہیں۔"

[۲۰۱۱ء]



Marfat.com

# علم کی بنیاد

[۱]

علم کا اولین موضوع کیا ہے؟ ایک رائے یہ ہوسکتی ہے کہ علم کا اولین موضوع وجود ہے، اِس لیے کہ علم خود من جملہ موجودات ہے اور موجودات پر بحث سے پہلے وجود کی حقیقت زیرِ بحث آنی چاہیے۔ لیکن اِس میں مشکل یہ ہے کہ موجود کی اِس حیثیت سے قطع نظر کرلیا جائے کہ وہ معلوم ہے تو اُس پر بحث نہیں ہوسکتی۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ بحث سے پہلے اگر حق کو باطل اور صحیح کو غلط سے الگ پہچاننے کا کوئی معیار متعین نہ ہو تو ہم اپنے نتائجِ علمی پر مطمئن کس طرح ہوں گے؟ دوسری رائے یہ ہوسکتی ہے کہ علم کا اولین موضوع نفس ہے، لیکن اِس میں بھی وہی مشکل ہے جو اوپر وجود سے متعلق بیان ہوئی۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ علم کا اولین موضوع خود علم ہی کو قرار دیا جائے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ علم نفس کے احوال میں سے ہے اور ذات ہمیشہ صفات واحوال پر مقدم ہوتی ہے، لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ صفات پر بحث کو ذات کی بحث کے تابع ہونا چاہیے۔ مگر ذات کی بحث کیا ہے؟ یہ اگر غور کیجیے تو صفات ہی کی بحث ہے، خاص طور پر اُس صفت کی جو تمام صفات میں سب سے خاص، سب سے مقدم اور سب سے بڑھ کر اُس کی



Marfat.com

ماہیت میں داخل ہو۔ نفس کے احوال میں علم کی حیثیت یہی ہے، اِس لیے کوئی چارہ نہیں کہ سب سے پہلے خود علم کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

امام حمید الدین فراہی کے علوم و معارف میں جس چیز کو منطق اعلیٰ یا میزان سے تعبیر کیا گیا ہے، اُس کا موضوع یہی ہے۔ امام نے متنبہ فرمایا ہے کہ یہ وہ منطق نہیں ہے جس کی ابتدا ''اورجانون'' (Organon) کے مصنف سے ہوئی تھی*۔ اِس لیے کہ وہ منطق اُس علم سے بحث کرتی ہے جس کا اکتساب اولیات سے استدلال کے طریقے پر کیا جاتا ہے۔ یہ اولیات اُس کا موضوع نہیں ہیں، اِنھیں اصول موضوعہ کی حیثیت سے مان لیا جاتا ہے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ اِن پر بحث کا موقع علم مابعد الطبیعیات میں ہے، مگر اِس علم کو دیکھا جائے تو اِس کے موضوعات عدد، وجود اور اِس نوعیت کے دوسرے مقولات ہیں جنھیں زیادہ سے زیادہ معلومات عامہ کہا جا سکتا ہے۔ علم کی بنیاد کیا ہے؟ اِس پر اُس میں بھی کوئی بحث نہیں کی گئی۔ چنانچہ تمام عمارت ہوا پر قائم ہے اور

---

* یعنی ارسطو جس نے جدلی دلائل (Dilectical Arguments) کے نام سے اِس کو ایک باقاعدہ فن کی صورت دی۔ ''اورجانون'' کے مباحث کو اُس کے قدیم مترجمین ایساغوجی (Categories)، انولوطیقا (Analytics) اور طوبیقا (Topics) کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ابتدا تھی، اِس فن کے جو خط و خال بعد میں متعین ہوئے، اُن کے لیے یہ اسکندر افرودیسی کی اُن کاوشوں کا مرہون منت ہے جو اُس نے ''اورجانون'' کی شرح و وضاحت کے لیے انجام دی ہیں۔



Marfat.com

تشکیک و جہالت کے جس دروازے کو بند کرنے کے لیے اِس تمام جدوجہد کی ابتدا ہوئی تھی، وہ اُسی طرح کھلا رہ گیا ہے، جس طرح اِس فن کی ترتیب وتدوین سے پہلے کھلا ہوا تھا۔

امام نے لکھا ہے کہ اِس عنوان کے تحت اُس چیز پر بحث ہونی چاہیے جس سے علم اضطراراً اور سب سے پہلے متعلق ہوتا اور اُس کے ضروری قضایا متعین ہو جاتے ہیں۔ یہاں کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ اِس سے اُن کی مراد اولیات ہیں۔ ہرگز نہیں، یہ اُن سے پہلے کی چیز ہے جسے وہ بنائے علم کہتے ہیں، جو اگر منہدم ہو جائے تو علوم کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے، بلکہ خود علم ویقین کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اِس معاملے میں غلطی کھائی ہے، وہ اضطراب وتوہمات اور حیرت واستعجاب کی تاریکیوں میں گم ہیں اور اُنھوں نے معلوم کو مجہول اور ثابت کو معدوم بنا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اِن تاریکیوں سے نکلنے کے لیے اولاً، اُس چیز کو سمجھا جائے جو تمام علم وحکمت کی بنیاد ہے اور ہمارا یقین اُس سے فطری اور اضطراری طور پر متعلق ہوتا ہے۔ ثانیاً، استدلال کے فطری طریقے کو سمجھا جائے جسے منطق نے ترک کر رکھا ہے۔ تمام علوم کے دروازے اِسی سے کھلیں گے اور ہم ایک ایسی میزان دریافت کر لیں گے جسے میزان حکمت کہنا چاہیے۔

[۲]

تمام علم وحکمت کی بنیاد اُن الہامات پر ہے جو انسان کی فطرت میں ازل سے



Marfat.com

ودیعت ہیں۔ یہی مدارک تک پہنچتے اور اُن کے لیے علوم و اعمال اور نظر و استدلال کا منبع بنتے ہیں۔ عقل اِن کے حضور میں محکوم محض ہے، وہ اِن کے احکام سے انحراف نہیں کرسکتی۔ انسان کی زندگی اِنھی پر یقین سے عبارت ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اِس یقین کی حقیقت کو سمجھا جائے۔ امام حمید الدین فراہی نے اِس کے جن مبادی کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ ہر ذی حیات عالم خارجی کا یقین رکھتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِس یقین کا ظہور حسی علم کے بعد ہی ہوتا ہے، لیکن کیا مجرد احساس اِس کا باعث بن جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے، ہم جب کسی جسم کو چھوتے ہیں تو ہمارا احساس محض ایک حالت ہوتی ہے جو حاسۂ انسانی پر طاری ہو جاتی ہے۔ اِس کے ساتھ اگر ایک حاکم نہ ہو جو حکم لگائے کہ اِس اثر کے لیے ایک موثر ہے تو ممکن نہیں کہ اپنے خارج میں ہم کسی چیز کا یقین حاصل کرسکیں۔ یہ حاکم کون ہے، جس کے سامنے انسان کا ارادہ و اختیار محکوم محض ہو کر رہ جاتا ہے؟ یہ، اگر غور کیجیے تو وہی الہام ہے جو نفس انسانی پر حکومت کر رہا ہے۔ چنانچہ کسی چیز کو چھونے کے بعد جو احساس منتقل ہوتا ہے، اُسی کے ساتھ ایک نوعیت کا فطری استدلال بھی وجود میں آتا ہے جو ہمیں اثر سے موثر تک پہنچا دیتا ہے۔ اِس استدلال کے لیے کوئی مقدمات ترتیب نہیں دیے جاتے۔ یہ فکر و ارادہ کے بغیر وجود میں آتا اور ایسا قوی ہوتا ہے کہ ہم اِس سے اختلاف کرنا بھی چاہیں تو نہیں کرسکتے۔ اِس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارا کسی چیز کو



Marfat.com

جاننا اور اُس کے وجود کا یقین حاصل کر لینا علم و یقین کی اُسی قوت کا ظہور ہے جو ہماری فطرت میں ودیعت ہے۔ انسان کو یہ قوت اُس کے خالق نے بالکل اُسی طرح عطا فرمائی ہے، جس طرح اُس کے حواس اور دوسری قوتیں عطا فرمائی ہیں۔

۲۔ ہمارے نفس کا یہ اذعان کہ ایک خارجی عالم موجود ہے، درحقیقت اُس کے اِس اذعان پر مبنی ہے کہ وہ خارج سے الگ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ نفس عالم و معلوم کو، یعنی اُس کو جو محسوس کرتا ہے اور جسے محسوس کیا جاتا ہے، الگ الگ پہچانتا ہے۔ یہ ایک قطعی حقیقت ہے، اِس لیے کہ ایسا نہ ہوتا تو وہ محسوس کو اپنے ساتھ متحد ٹھیراتا اور اپنے اندر کبھی یہ اذعان پیدا نہ کر سکتا کہ محسوس اُس کی ذات سے الگ ایک خارجی وجود ہے۔

نفس کا یہ علم اثر سے موثر پر اُس کے استدلال سے متفرع نہیں ہے، بلکہ اُس کے شرائط و مقدمات میں سے ہے۔ چنانچہ نفس جس طرح اپنی ذات میں اور عالم خارجی میں فرق کرتا ہے، بالکل اُسی طرح اپنی ذات اور اُن اثرات میں بھی فرق کرتا ہے جو اُس کے داخلی محسوسات کی حیثیت سے اُس پر وارد ہوتے ہیں۔ یہ فرق و امتیاز، اگر غور کیجیے تو اُس کے لیے صرف اِس لیے ممکن ہوا ہے کہ وہ حامل و محمول اور ذات اور اُس کے عوارض کو الگ الگ دیکھ سکتا ہے۔ نفس نے یہ چیز فکر و تدبر اور ترتیب مقدمات سے حاصل نہیں کی، بلکہ فاطر فطرت کی طرف سے اُس پر الہام کی گئی ہے۔ اِسے خارجی عالم پر ہمارے یقین سے بھی زیادہ راسخ اور اُس پر مقدم سمجھنا چاہیے، اِس لیے کہ یہی



Marfat.com

وہ اصل ہے جس پر خارج سے متعلق ہمارا یقین مبنی ہے۔

۳۔ اِسی الہام میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ ذات کے بغیر صفات کا کوئی تصور نہیں ہے۔ چنانچہ نفس جس طرح اِس بات کا یقین رکھتا ہے کہ وہ ایک ذات ہے جو صفات کی حامل ہوسکتی ہے، اُسی طرح اِس بات کا بھی یقین رکھتا ہے کہ اُس کی صفات ہیں جو اِسی ذات سے قائم ہیں۔

۴۔ پھر یہی نہیں، وہ کسی چیز کی طرف مائل ہوتا ہے اور کسی سے گریز کرتا ہے۔ اِسی طرح کسی معاملے پر حسن اور کسی پر قبح کا حکم لگاتا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ صرف اِس لیے کہ وہ ترک واختیار اور مرغوبات ومکروہات میں امتیاز کرسکتا اور اختیار وتصرف کا یقین رکھتا ہے۔ اُس کی زندگی اِسی یقین سے ہے۔ وہ اِس سے بہرہ مند نہ ہوتا تو اُس سے نہ کسی چیز کے لیے جدوجہد متصور ہوسکتی تھی اور نہ کسی فعل کا ارادہ۔ یہ حقیقت ہے کہ جس طرح علم وادراک کے معاملے میں اُس کا یقین الہامی ہے، اُسی طرح اختیار وارادہ، فعل وتصرف، لذت والم اور نفرت ومحبت کے معاملے میں بھی الہامی ہے۔

۵۔ اِسی کے تحت یہ بات بھی ہے کہ اُسے محسوسات خارجی میں انفعال کا یقین ہے۔ وہ ہمیشہ سے جانتا ہے کہ محسوسات خارجی اُس کے افعال کا تاثر قبول کرتے ہیں۔ وہ جب ہاتھ بڑھاتا ہے یا کسی چیز کو اپنی گرفت میں لیتا ہے تو اپنے اِسی علم ویقین کا اظہار کرتا ہے۔ اُسے یہ یقین نہ ہوتا تو وہ اِن میں سے کوئی اقدام بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اُس کے تمام افعال اِسی پر مبنی ہیں کہ وہ دوسرے کے انفعال وتاثر کا یقین رکھتا



Marfat.com

ہے۔اپنے جسمانی آلات اوراپنی فطری اورحسی قوتوں کے استعمال کی ابتدا اُس نے اِسی یقین سے کی ہے۔ چنانچہ اِس سے جوافعال پیدا ہوئے ہیں، یہ اُنھی کی تکرار ہے جواُس کے اِس اذعان کا باعث بن گئی ہے کہ وہ محسوسات خارجی میں تصرف کرسکتا ہے۔

۶۔ جو چیزیں نفس کے مماثل نہیں ہیں، وہ اُن میں اوراپنی ذات میں فرق کرسکتا ہے۔اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مدرک اور غیر مدرک میں امتیاز کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ دیکھتا ہے کہ اُس کی صفات سے الگ کچھ ایسی صفات بھی ہیں جواُس کے ادراک میں آتی ہیں،مگر وہ اُن کا حامل نہیں ہے۔ پھراُن کا حامل کون ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی ایسی ذات جواُس کے مماثل نہیں ہوسکتی۔ہم بیان کر چکے ہیں کہ نفس کے الہامات میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ ذات کے بغیر صفات کا کوئی تصور نہیں ہے۔لہٰذا یہی مقام ہے جہاں سے وہ یقین حاصل کر لیتا ہے کہ اُس کے گردوپیش میں ایسے موجودات ہیں جواُن صفات سے متصف ہیں جواُس کی ذات سے الگ ہیں۔

۷۔خیر وشر کا امتیاز بھی من جملہ الہامات نفس ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نفس انسانی صرف مرغوبات ومکروہات میں امتیاز نہیں کرتا، اِس کے ساتھ اُن پر خیر وشراور بر واثم کا حکم بھی لگاتا ہے۔ چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ تمام مرغوبات کو خیراور تمام مکروہات کو شرسمجھ لے۔ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ اپنے آپ کو وہ گاہے بلندی اور گاہے پستی کی طرف کھنچتا ہوادیکھتااوراپنے میلانات میں بہت کچھ اختلاف پاتا ہے۔ پھر یہی نہیں، وہ یہ



Marfat.com

بھی جانتا ہے کہ طیب خبیث سے اور بلندی پستی سے کس طرح الگ ہے۔ چنانچہ وہ اتراتا بھی ہے اور جھجکتا بھی، مدح بھی کرتا ہے اور مذمت بھی، اعتراف عظمت بھی کرتا ہے اور ملامت بھی۔ اِسی طرح غیرت وحمیت بھی دکھاتا ہے۔ یہ سب، اگر غور کیجیے تو فجور وتقویٰ کے اُسی الہام کا نتیجہ ہے جو اُس کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔

[۳]

علم کی تقسیم اگر اُس کے درجات کے لحاظ سے کی جائے تو وہ اضطراری ہوگا یا استدلالی۔ پہلے درجے میں ذات باری اور نفس اور اُس کے خارج کا علم ہے۔ دوسرے درجے میں صفات باری اور نفس اور اُس کے خارج کے احوال کا علم ہے۔ اِس دوسری قسم کے لیے بنائے استدلال ضروری ہے۔ یہ بنائے استدلال الہامات فطرت بھی ہوسکتے ہیں جنھیں ہم اضطراری علم سے تعبیر کرتے ہیں؛ فکر واستنباط کے نتائج بھی ہوسکتے ہیں جو معلوم کے درجے تک پہنچ گئے ہوں اور ماضی کا علم بھی جو تعلیم وتعلم کے ذریعے سے منتقل ہوا ہو۔ یہ سب چیزیں، اگر غور کیجیے تو وہی ہیں جو پہلے سے ہمارا یقین واذعان بن چکی ہوتی ہیں۔ اِسی طرح بنا اور مبنی میں لازم وملزوم کی نسبت ضروری ہے، اِس طرح کہ اگر بنا کو مانا جائے تو جو اُس پر مبنی ہے، اُس کو ماننا بھی لازم ہو جائے۔ پھر یہ بنائے استدلال کسی اصل کی فرع ہوگی یا فرع کی اصل اور دونوں میں لزوم متحقق ہوگا۔ امام فراہی لکھتے ہیں کہ اِس سے استدلال کی جو اقسام وجود میں آئیں گی، وہ یہ



Marfat.com

تین ہیں:

اولاً، فرع سے اصل پر استدلال، اِس لیے کہ فرع ہے تو اصل کو بھی لازماً ہونا چاہیے۔

ثانیاً، اصل سے فرع پر استدلال، اِس لیے کہ اصل فرع کو متضمن ہوتی ہے، لہٰذا اصل پر غور کیا جائے تو وہ جن فروع کو متضمن ہے، اُن سب پر دلالت کرے گی۔ اصل کو ہم اِسی بنا پر اصل اور فرع کو فرع کہتے ہیں۔

ثالثاً، فرع سے دوسرے فروع پر استدلال، جس کا ذریعہ اصل کا ثبوت ہوگا۔ چنانچہ فرع پہلے اپنی اصل پر دلالت کرے گی، پھر اصل دوسرے تمام فروع تک پہنچا دے گی۔

انسان اپنے تمام افکار و اعمال میں فطری طور پر استدلال کے یہی طریقے استعمال کرتا ہے۔ اِن میں غلطی اُسی وقت ہوتی ہے، جب وہ اصل اور فرع کے مابین نسبت کے بارے میں فکر و نظر سے اعراض کر لیتا ہے۔

[۲۰۱۲ء]

# قطعی الدلالۃ

قرآن قطعی الدلالۃ ہے۔ چنانچہ اُس کے مخاطبین جب اُس کے کسی دعوے



Marfat.com

کو نہیں مانتے تو پوری شان کے ساتھ کہتا ہے کہ 'اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ'* (تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے، لہٰذا کسی شبہے میں نہ رہو)۔ اور انکار پر اصرار کریں تو اِسی بنا پر اُنھیں یہ کہہ کر مباہلے کا چیلنج دے دیتا ہے کہ یہ 'العلم' ہے جو تمھارے پروردگار کی طرف سے آ گیا ہے۔ اِس کے مقابلے میں ہر چیز محض کذب و افترا یا ظن و گمان ہے اور حق کے مقابلے میں ظن کوئی حیثیت نہیں رکھتا: 'اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا'**۔

اُس کی یہی حیثیت آج بھی ہے، اِس لیے کہ اُس کے الفاظ جس تواتر کے ساتھ نقل ہوئے ہیں، اُن کے مفاہیم بھی اُسی طرح نقل کیے گئے ہیں۔ قرآن کے علما جس چیز میں اختلاف کرتے ہیں، وہ الفاظ کے مفاہیم نہیں، بلکہ کسی خاص موقع و محل کے لیے اُن مفاہیم میں سے کسی مفہوم کا انتخاب ہے۔ یہ مفاہیم کتابوں میں ثبت ہوئے ہیں، اِنھیں علما، فقہا، ادبا اور مفسرین نے جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ یہ مسلمانوں کے مدرسوں، خانقاہوں اور علم و ادب کی مجالس میں پڑھے پڑھائے اور سمجھے سمجھائے گئے ہیں۔ زمانۂ رسالت سے لے کر آج تک یہ سلسلہ اِسی تواتر کے ساتھ جاری ہے، اِس میں کبھی کوئی انقطاع نہیں ہوا۔ یہی معاملہ اُس کی زبان کے قواعد و اسالیب کا ہے۔ اُنھیں بھی اِسی تواتر کے ساتھ نقل کیا گیا اور پڑھا اور پڑھایا گیا ہے۔ اِس میں شاذ اگر

* آل عمران ۳: ۶۰۔

** آل عمران ۳: ۶۱-۶۳۔ النجم ۵۳: ۲۸۔



Marfat.com

کوئی استثنا کہیں بیان کیا جا سکتا ہے تو اپنی دلالت سے یہی متواترات اُس کو بھی درجۂ یقین میں لے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کے متعلق یہ بات آج بھی پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انسان اُس کے الفاظ کی رہنمائی قبول کر لے تو وہ قطعیت کے ساتھ اُسے ٹھیک اُس مدعا تک پہنچا دیتے ہیں جس کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

زبان کی نقل و روایت اور لفظ و معنی کے باہمی ربط سے متعلق جو مسائل لوگوں کے لیے اِس باب میں مزلۂ قدم ثابت ہوئے ہیں، اُن میں سے بعض کی غلطی ہم اپنی کتاب ''میزان'' کے مقدمے میں واضح کر چکے ہیں اور بعض پر کسی تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ سوفسطائی نظریات حیات و کائنات کی سنگین حقیقتوں کے مقابلے میں جس طرح اِس سے پہلے قصۂ پارینہ بنے ہیں، یہ نئی سوفسطائیت بھی عنقریب اِسی طرح قصۂ پارینہ بن جائے گی۔ اِس کی تردید و تغلیط میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اِسی طرح بعض نئے قلم کاروں کی یہ بات بھی قابل توجہ نہیں ہے کہ عام قطعی الدلالۃ نہیں ہوتا اور قرآن کی زیادہ تر آیتیں چونکہ اِسی طرح کے الفاظ پر مشتمل ہیں، لہٰذا قرآن بھی قطعی الدلالۃ نہیں ہو سکتا۔ اہل علم خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کیسی طفلانہ اور علم و دانش سے کتنی بعید ہے جس کے کہنے والے الفاظ کی وضع لغوی اور وضع استعمالی کا فرق بھی نہیں جانتے۔

ایک اعتراض، البتہ مستحق ہے کہ اُس سے تعرض کیا جائے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ قرآن کی بیش تر آیات کے سمجھنے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے، اِس لیے وہ



Marfat.com

محتمل الوجوہ ہیں اور کوئی محتمل الوجوہ کلام قطعی الدلالۃ نہیں ہوسکتا۔ قطعی الدلالۃ اُسی کلام کو کہیں گے جس کی تاویل میں کوئی اختلاف نہ ہو۔

اِس اعتراض میں اتنی بات بالکل صحیح ہے کہ کوئی محتمل الوجوہ کلام قطعی الدلالۃ نہیں ہوسکتا، لیکن کیا ہر وہ کلام جس کی تاویل میں اختلافات ہوں، محتمل الوجوہ ہوجاتا ہے؟ ہمارا جواب ہے کہ ہرگز نہیں۔ محتمل الوجوہ ہونا کلام کی مستقل صفت ہے، یہ اُسے عارض نہیں ہوتی۔ آپ کسی کلام کو محتمل الوجوہ قرار دینا چاہتے ہیں تو ثابت کیجیے کہ اُس کی تاویل میں جو اختلافات بیان کیے جا رہے ہیں، وہ ہمیشہ سے قائم ہیں اور ہمیشہ قائم رہیں گے۔ علم و استدلال کسی حال میں اُس کے وجود سے اُنھیں منفک نہ کرسکیں گے۔ ایک شخص کسی کلام کو سنتا یا پڑھتا ہے اور اُس کے کسی لفظ، کسی محاورے یا کسی تالیف کے معنی غلط سمجھ لیتا ہے۔ دوسرا جملے کے دروبست کو نظر انداز کر کے اُس کا ایک مفہوم بیان کر دیتا ہے۔ تیسرا ہر جملے کو منفرد خیال کرتا ہے اور سیاق و سباق اور نظم کلام کی پروا کیے بغیر اُس کا ایک مدعا بیان کرتا ہے۔ کیا یہ سب وجوہ کلام ہیں اور اِن کی بنا پر اُسے محتمل الوجوہ کہا جائے گا؟ قرآن کی تاویل میں جتنے اختلافات ہوئے ہیں، سب کی نوعیت یہی ہے۔ چنانچہ اُس کی کوئی ایک آیت بھی نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اصلاً محتمل الوجوہ ہے اور سلف سے خلف تک تمام علما متفق رہے ہیں کہ اُس میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال ماننا ضروری ہے۔ اِس کے برخلاف صورت حال یہ ہے کہ جتنے اقوال کسی آیت کے بارے میں نقل ہوئے ہیں، اُن میں



Marfat.com

سے بعض اختیار کیے گئے اور بعض چھوڑ دیے گئے ہیں۔ پھر جو چھوڑ دیے گئے ہیں، اُنھیں دوسرے اہل علم نے اختیار کر لیا ہے اور جو اختیار کیے گئے ہیں، اُنھیں چھوڑ دیا ہے۔ علما اِس ترک واختیار کے وجوہ بھی بیان کرتے ہیں۔ کہیں بتایا جاتا ہے کہ لغت اُس معنی کی تائید نہیں کرتی جو کسی قول میں اختیار کیے گئے تھے، کہیں تالیف کو سمجھنے کی غلطی واضح کی جاتی ہے، کہیں دروبست کو نظر انداز کرنے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور کہیں سیاق وسباق اور نظم کلام سے استدلال کیا جاتا ہے۔ فقہ وکلام اور تفسیر کی کتابیں اِن مباحث سے بھری پڑی ہیں۔ ابن جریر لوگوں کے اقوال نقل کرنے میں سب سے زیادہ فیاض ہیں، لیکن تفسیر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جگہ جگہ مختلف اقوال پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ ابن کثیر اُنھی کا خلاصہ ہے، مگر یہ خلاصہ خود اصول ترجیح کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ زمخشری، قرطبی، آلوسی، طباطبائی، ابوالاعلیٰ مودودی، سب کی تفسیریں اِس کی شہادت دیتی ہیں۔ دنیا کی دسیوں زبانوں میں قرآن کے ترجمے ہوئے ہیں۔ اُنھیں دیکھ لیجیے کسی مترجم نے قرآن کی کسی ایک آیت کو بھی محتمل الوجوہ قرار دے کر اُس کا ترجمہ نہیں کیا، بلکہ ہر جگہ اپنی ترجیح قائم کی ہے اور اُسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ اِس کا منتہائے کمال امام فراہی کی تفاسیر اور استاذ امام امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' ہے، جن میں ترجمہ ہی نہیں، تفسیر میں بھی ہر جگہ ایک ہی قول کو ترجیح دی گئی ہے۔ اِس ترجیح سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے، مگر یہ اختلاف خود اِس بات کی دلیل ہوگا کہ اختلاف کرنے والا کلام کو محتمل الوجوہ نہیں مانتا۔ وہ اصرار کر رہا ہے کہ جو معنی سمجھے گئے



Marfat.com

ہیں، وہ فلاں اور فلاں وجوہ سے صحیح نہیں ہیں۔

لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ تاویل کے اختلافات اور کلام کے احتمالات میں فرق نہیں کرتے۔ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ تاویل کے اختلافات قلت علم سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور قلت تدبر سے بھی۔ پھر قلت تدبر کے بھی وجوہ ہیں۔ لوگوں کی ذہنی تربیت، اُن کی خواہشات، تعصّبات، عجلت پسندی، اشتغال بالادنیٰ اور اِس نوعیت کی بہت سی چیزیں اِس کا باعث بن جاتی ہیں۔ اِن میں سے کوئی بات بھی نہ ہو تو قرآن جیسی مقدس کتاب کے بارے میں تنہا یہ احتیاط نقد و جرح سے گریز کا باعث بن جاتی ہے کہ معنی کی ترجیح میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ اِس کے برخلاف کلام کے احتمالات اُس کی پیدایش کے وقت سے اُس میں ودیعت ہوتے ہیں۔ پڑھنے یا سننے والا اُنھیں دریافت کر لے تو کبھی کلام سے الگ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ جب بیان کیے جاتے ہیں تو ہر شخص ماننے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کلام کا پیدایشی عیب ہے، اِسے دور کرنا ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید اِس عیب سے بالکل مبرا ہے۔ اِس طرح کی کوئی چیز اُس کے بارے میں ثابت نہیں کی جا سکتی۔ وہ 'اَلْعِلْم' ہے، 'اَلْحَق' ہے، میزان اور فرقان ہے، عربی مبین میں نازل ہوا ہے، 'نَذِیْرًا لِّلْعٰلَمِیْنَ' ہے، لہٰذا پوری دنیا کے لیے خدا کی حجت ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ خدا کی کسی کتاب میں تضادات اور احتمالات نہیں ہوتے، وہ ہمیشہ قطعی الدلالۃ ہوتی ہے: 'لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا



Marfat.com

کَثِیرًا*۔

[۲۰۱۰ء]

# قطعی اور ظنی

ائمۂ اصول کی اصطلاح میں قطعیت احتمال کی نفی ہے۔ دلالت الفاظ کی بحث میں یہ لفظ دو معنی کے لیے بولا جاتا ہے: ایک، جب سرے سے احتمال نہ ہو۔ دوسرے، جب احتمال کی بنا جس دلیل پر رکھی جائے، وہ ناقابل التفات ہو۔ پہلے معنی کی مثال محکم اور متواتر ہیں اور دوسرے معنی کے لیے وہ ظاہر، نص اور خبر مشہور کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں**۔ استاذ مخلوف نے ''الموافقات'' پر اپنی تعلیقات میں لکھا ہے:

یستعمل القطع فی دلالة ''یہ لفظ جب دلالت الفاظ کے

---

* النساء۴: ۸۲۔ ''اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں وہ بہت کچھ اختلاف پاتے۔''

** التوضیح والتلویح، ابن مسعود الحنفی، مسعود بن عمر التفتازانی ۱/ ۲۴۲۔ کشاف اصطلاحات الفنون، التھانوی ۲/ ۱۲۰۰۔



Marfat.com

الألفاظ فيأتي على نوعين: أولهما الجزم الحاصل من النص القاطع، وهو ما لا يتطرقه إحتمال أصلًا... ثانيهما العلم الحاصل من الدليل الذى لم يقم بإزائه إحتمال يستند إلى أصل يعتد به، و لا يضره الإحتمالات المستندة إلى وجوه ضعيفة أو نادرة.

(الموافقات، الشاطبی ۱/۱۳)

باب میں استعمال کیا جاتا ہے تو دو صورتوں کے لیے آتا ہے: ایک اُس جزم کے لیے جو نصِ قطعی سے حاصل ہوتا ہے، یعنی وہ نص جس میں سرے سے احتمال کی گنجایش نہ ہو... دوسرے اُس علم کے لیے جو اُس دلیل سے حاصل ہوتا ہے جس کے مقابل میں کوئی ایسا احتمال نہ ہو جس کی بنا قابل لحاظ سمجھی جائے۔ نادر اور کمزور وجوہ پر مبنی احتمالات اُس پر اثر انداز نہیں ہوتے۔''

اِسی قطعیت کو علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اُس کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے کہ علم اُس صفت سے عبارت ہے جس سے حقائق میں ایسا امتیاز حاصل ہو جائے کہ نقیض کا احتمال نہ رہے۔ قرآن جب اپنے بارے میں کہتا ہے کہ وہ 'اَلْعِلْم' اور 'اَلْحَق' ہے یا اپنے اندر تضادات کی نفی کرتا ہے تو اِسی حقیقت کا اعلان کرتا ہے۔ اِس کے مقابل میں لفظ ظن ہے۔ اِس میں احتمال کی نفی ممکن نہیں ہوتی، صرف ایک احتمال کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ بعض کم سواد یہ سمجھتے ہیں کہ ہر وہ علم جو غور و تفحص سے حاصل کیا جائے یا اُس میں غلطی کا امکان مان لیا جائے، وہ ظنی ہوتا ہے۔ ہرگز نہیں، غور و تفحص سے حاصل ہونے



Marfat.com

والے علم کو نظری کہا جاتا ہے جو قطعی بھی ہوتا ہے اور ظنی بھی۔ چنانچہ اُس کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ 'هو الفكر الذى يطلب به من قام به علمًا أو ظنًا'۔ آمدی نے مزید وضاحت کی ہے کہ 'هو عام للنظر المتضمن للتصور و التصديق، والقاطع و الظني'۔* رہا غلطی کا امکان تو یہ محسوسات اور تجربیات تک میں مانا جا سکتا ہے، اِس لیے کہ انسان جب تک انسان ہے، غلطی سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ ائمۂ اصول کی اصطلاح میں ظنی الدلالۃ کی تعبیر اِس کے لیے نہیں، بلکہ اُس کلام کے لیے اختیار کی جاتی ہے جس میں نقیض کا احتمال مان لیا جائے، یعنی تسلیم کر لیا جائے کہ ترجیح، بے شک اُسی مفہوم کی ہے جو 'هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ' سے بالعموم سمجھا جاتا ہے، لیکن اِس جملے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ ایک نہیں ہے۔ اِس طرح کا احتمال ہے جو کسی کلام کو ظنی الدلالۃ بناتا ہے۔ رہے یہ احتمالات کہ 'هُوَ' مبتدا ہے اور لفظ 'اَللّٰهُ' اُس کی خبر ہے اور 'اَحَدٌ' دوسری خبر یا 'هُوَ' ضمیر الشان ہے اور 'اللّٰهُ اَحَدٌ' مبتدا اور خبر ہیں تو یہ مدعا کے احتمالات نہیں ہیں، تالیف کے احتمالات ہیں جو کلام کی قطعیت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہی معاملہ اُن اختلافات کا ہے جو ہم ائمۂ سلف کے تفسیری اقوال میں دیکھتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے اپنے ''مقدمة فى التفسير'' میں بالکل صحیح لکھا ہے:

فإن منهم من يعبر عن الشئ ''(یہ) اِس لیے (محسوس ہوتے

---

* اِن تمام تعریفات اور مباحث کے لیے دیکھیے: الاحکام فی اصول الاحکام، الآمدی ۱/۱۰۔ کشاف اصطلاحات الفنون، التھانوی ۲/۱۳۸۶۔



Marfat.com

بلازمه أو بنظيره، و منهم من ينص على الشئ بعينه، والكل بمعنى واحد في أكثر الأماكن، فليتفطن اللبيب لذالك.
(تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۱/۱۰)

ہیں) کہ اُن میں سے کوئی شے کو اُس کے لازم یا اُس کی نظیر سے تعبیر کر دیتا ہے اور کوئی کسی چیز کو بعینہٖ بیان کرتا ہے، لیکن معنی میں اختلاف نہیں ہوتا، وہ اکثر مقامات میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ یہ بات ہر عاقل کو سمجھ لینی چاہیے۔"

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ لفظ قطعیت کے جو معنی اوپر بیان ہوئے ہیں، قرآن کی تمام آیات اُنھی میں محصور ہیں۔ زیادہ تر آیتوں میں سرے سے کوئی احتمال نہیں ہے، اِس لیے کہ اُن کے الفاظ ہی اُن کی تفسیر ہیں اور اُن میں نسخ، تخصیص یا تبدیلی اور تغیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اِن کے علاوہ جتنی آیتیں ہیں، اُن کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔ تمام احتمالات اُنھی میں پیدا کیے جاتے ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محل تدبر ہیں اور تدبر کا حق ادا نہ کیا جائے تو مدعا مخفی رہ جاتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ حق ادا کیا جائے تو دلیل روز روشن کی طرح واضح کر دیتی ہے کہ اُس کے مقابل میں کوئی ایسا احتمال نہیں ہے جسے 'يستند إلى أصل يعتد به'* قرار دیا جا سکے۔ دور حاضر میں قرآن کے جلیل القدر عالم اور محقق امام حمید الدین فراہی نے اِسی بنا پر

* یعنی ایسا احتمال جس کی بنا قابل لحاظ ہو۔



Marfat.com

فرمایا ہے کہ قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کا احتمال نہیں ہوتا۔ وہ قطعی الدلالۃ ہے۔ یہ محض قلت علم اور قلت تدبر ہے جو اختلافات کا باعث بن جاتی ہے۔ قرآن کے طالب علموں کو متنبہ رہنا چاہیے کہ اُس کی تمام معنی آفرینی اِسی قطعیت کی تلاش میں پنہاں ہے۔ اُن کے یقین واذعان کو اِس پر کبھی متزلزل نہیں ہونا چاہیے۔

[۲۰۱۱ء]

# عام اور خاص

دنیا کی کسی زبان میں بھی یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہر لفظ ایک معنی اور ہر اسلوب ایک ہی مدعا کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ یہ بالعموم متعدد معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ کہ کسی کلام میں یہ کس مفہوم کے لیے استعمال ہوئے ہیں، ہمیشہ اِسی بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ جملے کی تالیف، متکلم کا عرف، نظم کلام، سیاق وسباق اور اِس نوعیت کے بعض دوسرے قرائن کیا حکم لگاتے ہیں۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ذہن تمام احتمالات کو سامنے رکھ کر کبھی فکر وتدبر کے بعد اور کبھی بادنیٰ تامل اپنا فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔ زبان سے متعلق یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر امام شافعی نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں قرآن کے خاص وعام سے متعلق فرمایا ہے کہ زبان محتمل المعانی ہوتی ہے۔ اُس کے خاص و



Marfat.com

عام بھی جب کسی کلام کا جزو بن کر آتے ہیں تو ضروری نہیں ہے کہ ہر حال میں اُسی معنی کے لیے آئیں جس کے لیے وہ اصلاً وضع کیے گئے ہیں۔ اللہ کی کتاب اِس طرح نازل ہوئی ہے کہ اُس میں لفظ عام ہوتا ہے، مگر اُس سے خاص مراد لیا جاتا ہے اور خاص ہوتا ہے، مگر اُس سے عام مراد لیا جاتا ہے*۔ لہٰذا نہ خاص کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مدلول کے لیے قطعی ہے اور نہ عام کے بارے میں کہ وہ اپنے تحت تمام افراد پر لازماً دلالت کرے گا۔ ائمۂ اصول کے ایک گروہ کو اِس سے اختلاف ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اِس معاملے میں امام شافعی کا نقطۂ نظر ہی صحیح ہے، اِس لیے کہ یہ مجرد لفظ نہیں، بلکہ اُس کا موقع استعمال ہے جو سامع یا قاری کو اُس کے مفہوم سے متعلق کسی حتمی نتیجے تک پہنچاتا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' کے مقدمہ ''اصول و مبادی'' میں لکھا ہے:

''...قرآن میں یہ اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے کہ بظاہر الفاظ عام ہیں، لیکن سیاق و سباق کی دلالت پوری قطعیت کے ساتھ واضح کر دیتی ہے کہ اُن سے مراد

---

* الرسالہ، الشافعی ۲۳۰۔ یہی وہ بات ہے جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ امام شافعی بھی الفاظ کی دلالت کو اُن کے معانی پر ظنی مانتے ہیں، دراں حالیکہ وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زبان میں ایک سے زیادہ مفاہیم کا احتمال ہوتا ہے، اِس لیے کسی ایک احتمال کو سامنے رکھ کر فیصلہ سنانے کے لیے مبادرت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ تدبر کے ساتھ دیکھنا چاہیے کہ کسی خاص موقع پر کون سا مفہوم ہے جسے متکلم کا منشا قرار دیا جا سکتا ہے۔



Marfat.com

عام نہیں ہے۔ قرآن 'النَّاس ' کہتا ہے، لیکن ساری دنیا کا تو کیا ذکر، بارہا اِس سے عرب کے سب لوگ بھی اُس کے پیشِ نظر نہیں ہوتے۔ وہ 'عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ' کی تعبیر اختیار کرتا ہے، لیکن اِس سے دنیا کے سب ادیان مراد نہیں لیتا۔ وہ 'الْمُشْرِکُوْنَ ' کا لفظ استعمال کرتا ہے، لیکن اِسے سب شرک کرنے والوں کے معنی میں استعمال نہیں کرتا۔ وہ 'اِنَّ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ ' کے الفاظ لاتا ہے، لیکن اِس سے پورے عالم کے اہل کتاب مراد نہیں ہوتے۔ وہ 'الْاِنْسَان ' کے لفظ سے اپنا مدعا بیان کرتا ہے، لیکن اِس سے ساری اولادِ آدم کا ذکر مقصود نہیں ہوتا۔ یہ قرآن کا عام اسلوب ہے، جس کی رعایت اگر ملحوظ نہ رہے تو قرآن کی شرح و وضاحت میں متکلم کا منشا بالکل باطل ہو کر رہ جاتا ہے اور بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، لہٰذا ناگزیر ہے کہ اِس معاملے میں قرآن کے عرف اور اُس کے سیاق و سباق کی حکومت اُس کے الفاظ پر ہر حال میں قائم رکھی جائے۔''(۲۳)

زبان کی یہی نوعیت ہے جس کے پیش نظر قرآن کے علما و محققین تقاضا کرتے ہیں کہ متکلم کے منشا تک پہنچنا ہو تو محض ظاہر الفاظ کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اُن کے باطن کو سمجھ کر حکم لگانا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الٰہی کی یہی خدمت انجام دی ہے اور اپنے ارشادات سے اُن مضمرات و تضمنات کو واضح کر دیا ہے جن تک رسائی اُن لوگوں کے لیے مشکل ہو سکتی تھی جو لفظ و معنی کی اِن نزاکتوں کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ امام شافعی بجا طور پر اصرار کرتے ہیں کہ ظاہر الفاظ کی بنیاد پر آپ کی اِس تفہیم و تبیین سے صرف نظر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قرآن کا بیان ہے، اِس میں کوئی چیز



Marfat.com

قرآن کے خلاف نہیں ہوتی۔ خدا کا پیغمبر کتاب الٰہی کا تابع ہے۔ وہ اُس کے مدعا کی تبیین کرتا ہے، اُس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں کرتا۔ امام اپنی کتاب میں اِس کی مثالیں دیتے اور بار بار متنبہ کرتے ہیں کہ قرآن کے احکام سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ بیان اور صرف بیان ہے۔ اُسے نہیں مانا جائے گا تو یہ قرآن کی پیروی نہیں، اُس کے حکم سے انحراف ہوگا، اِس لیے کہ اُس کا متکلم وہی چاہتا ہے جو پیغمبر کی تفہیم و تبیین سے واضح ہو رہا ہے، اُس کا منشا اُس سے مختلف نہیں ہے۔

امام شافعی کی اِس بات سے زیادہ سچی بات کیا ہو سکتی ہے! لیکن امام کے استدلال کی کمزوری یہ ہے کہ بیش تر موقعوں پر وہ مبرہن نہیں کر سکے کہ لفظ اور معنی کے جس تعلق کو وہ بیان سے تعبیر کرتے ہیں، وہ اُن میں پیدا کس طرح ہوتا ہے؟ چنانچہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل کی چند ایسی روایتوں پر بھی مطمئن ہو گئے ہیں جنھیں کسی طرح بیان قرار نہیں دیا جا سکتا، دراں حالیکہ اُن کے بارے میں یہ بحث ہو سکتی تھی کہ اُن کے راویوں نے آپ کا مدعا ٹھیک طریقے سے سمجھا اور بیان بھی کیا ہے یا نہیں؟ امام شافعی کے نقطۂ نظر سے جو لوگ اختلاف کرتے ہیں، اُن کی اصلی الجھن یہی ہے۔

ہم نے ''میزان'' میں کوشش کی ہے کہ امام کے موقف کو پوری طرح مبرہن کر دیں، اِس لیے کہ اصولاً وہ بالکل صحیح ہے۔ اہل نظر ''میزان'' کے مقدمہ ''اصول و مبادی'' میں ''میزان اور فرقان'' کے زیرعنوان یہ مباحث دیکھ سکتے ہیں۔ اِس سے یہ



Marfat.com

حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن مجید کے احکام سے متعلق روایتوں میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اُس کے الفاظ کا مضمر ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تشریحات سے ظاہر کر دیا ہے۔ قرآن کے طالب علموں کو اِس سے لفظ کے باطن میں اتر کر اُس کو سمجھنے کی تربیت حاصل کرنی چاہیے، اِسے رد کر دینے یا اِس سے قرآن کے نسخ پر استدلال کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔

[۲۰۱۱ء]

# اصول و مبادی

ہم نے دین کو جس طرح سمجھا ہے، اُس میں تین چیزیں بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں:

اول یہ کہ قرآن حق و باطل کے لیے میزان اور فرقان اور تمام سلسلۂ وحی پر ایک 'مُهَيْمِن' ہے۔ یہ اِس لیے نازل کیا گیا ہے کہ دین و شریعت کے معاملے میں لوگوں کے مابین تمام اختلافات کا فیصلہ کر دے اور اِس کے نتیجے میں وہ ٹھیک حق پر قائم ہو جائیں۔ قرآن نے اپنی یہ حیثیت اپنے لیے خود بیان فرمائی ہے، لہٰذا اِس کی بنیاد پر جو باتیں اُس کے بارے میں بطور اصول ماننی چاہییں، وہ یہ ہیں:



Marfat.com

اولاً، اُس کا متن بالکل متعین ہے۔ یہ وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں امت مسلمہ کی عظیم اکثریت اِس وقت تلاوت کر رہی ہے۔ یہ تلاوت جس قراءت کے مطابق کی جاتی ہے، اُسے قراءت عامہ کہا جاتا ہے۔ اِس کے سوا کوئی دوسری قراءت نہ قرآن ہے اور نہ اُسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔

ثانیاً، قرآن قطعی الدلالۃ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے الفاظ پوری صلاحیت رکھتے ہیں کہ انسان اُن کی رہنمائی قبول کرلے تو اُسے قطعیت کے ساتھ ٹھیک اُس مدعا تک پہنچادیں جس کے لیے وہ لائے گئے ہیں۔ یہ صرف قلت علم اور قلت تدبر ہے جس کی بنا پر انسان بعض اوقات اُسے سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ قرآن کی زبان اور اُس کے اسالیب بیان سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اپنا مدعا بیان کرنے سے کبھی قاصر نہیں رہتا۔

ثالثاً، قرآن کی وہ سب آیتیں محکم ہیں جن پر اُس کی ہدایت کا مدار ہے اور متشابہات صرف وہ آیتیں ہیں جن میں آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت یا نقمت کا بیان تمثیل اور تشبیہ کے انداز میں ہوا ہے یا اللہ تعالیٰ کے صفات وافعال اور ہمارے علم اور مشاہدے سے ماورا اُس کے کسی عالم کی کوئی بات تمثیلی اسلوب میں بیان کی گئی ہے۔ یہ آیتیں نہ غیر متعین ہیں اور نہ اِن کے مفہوم میں کوئی ابہام ہے۔ اِن کے الفاظ بھی عربی مبین ہی کے الفاظ ہیں اور اِن کے معنی ہم بغیر کسی تردد کے سمجھتے



Marfat.com

ہیں۔ اِن کی حقیقت، البتہ ہم اِس دنیا میں نہیں جان سکتے، لیکن اِس جاننے اور نہ جاننے کا قرآن کے فہم سے چونکہ کوئی تعلق نہیں ہے، اِس لیے ہم اِس کے درپے بھی نہیں ہوتے۔

رابعاً، قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر وہ نازل ہوا ہے، اُس کے کسی حکم میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔ دین میں ہر چیز کے ردو قبول کا فیصلہ اُس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اُس سے شروع ہوتی اور اُسی پر ختم کر دی جاتی ہے۔ ہر وحی، ہر الہام، ہر القا، ہر تحقیق اور ہر رائے اُس کے تابع ہے۔ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اُس کی حکومت قائم ہے اور اُس کے خلاف اِن میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

دوم یہ کہ سنت دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اُس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن میں آپ کو ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ روایت بھی اُسی کا حصہ ہے۔ ثبوت کے اعتبار سے اِس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اِسی طرح اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا اِس کے بارے میں کسی بحث و



Marfat.com

نزاع کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔

سوم یہ کہ دین صرف وہی ہے جو قرآن و سنت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اِس کے علاوہ کوئی چیز دین ہے، نہ اُسے دین قرار دیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار آحاد جنھیں بالعموم ''حدیث'' کہا جاتا ہے، اُن سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔ دین سے متعلق جو چیزیں اُن میں آتی ہیں، وہ درحقیقت، قرآن و سنت میں محصور اِسی دین کی تفہیم و تبیین اور اِس پر عمل کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا بیان ہیں۔ حدیث کا دائرہ یہی ہے۔ چنانچہ دین کی حیثیت سے اِس دائرے سے باہر کی کوئی چیز نہ حدیث ہو سکتی ہے اور نہ محض حدیث کی بنیاد پر اُسے قبول کیا جا سکتا ہے۔

اِس دائرے کے اندر، البتہ حدیث کی حجت ہر اُس شخص پر قائم ہو جاتی ہے جو اُس کی صحت پر مطمئن ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل یا تقریر و تصویب کی حیثیت سے اُسے قبول کر لیتا ہے۔ اُس سے انحراف پھر اُس کے لیے جائز نہیں رہتا، بلکہ ضروری ہو جاتا ہے کہ آپ کا کوئی حکم یا فیصلہ اگر اُس میں بیان کیا گیا ہے تو اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

[۲۰۱۰ء]



Marfat.com

# حدیث وسنت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو قرآن دیا ہے۔ اِس کے علاوہ جو چیزیں آپ نے دین کی حیثیت سے دنیا کو دی ہیں، وہ بنیادی طور پر تین ہی ہیں:

۱۔ مستقل بالذات احکام وہدایات جن کی ابتدا قرآن سے نہیں ہوئی۔

۲۔ مستقل بالذات احکام وہدایات کی شرح ووضاحت، خواہ وہ قرآن میں ہوں یا قرآن سے باہر۔

۳۔ اِن احکام وہدایات پر عمل کا نمونہ۔

یہ تینوں چیزیں دین ہیں۔ دین کی حیثیت سے ہر مسلمان اِنھیں ماننے اور اِن پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اِن کی نسبت کے بارے میں مطمئن ہو جانے کے بعد کوئی صاحب ایمان اِن سے انحراف کی جسارت نہیں کر سکتا۔ اُس کے لیے زیبا یہی ہے کہ وہ اگر مسلمان کی حیثیت سے جینا اور مرنا چاہتا ہے تو بغیر کسی تردد کے اِن کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

ہمارے علما اِن تینوں کے لیے ایک ہی لفظ ''سنت'' استعمال کرتے ہیں۔ میں اِسے موزوں نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک پہلی چیز کے لیے ''سنت''، دوسری کے



Marfat.com

لیے ''تفہیم و تبیین'' اور تیسری کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ اصل اور فرع کو ایک ہی عنوان کے تحت اور ایک ہی درجے میں رکھ دینے سے جو خلط مبحث پیدا ہوتا ہے، اُسے دور کر دیا جائے۔

یہ محض اصطلاحات کا اختلاف ہے، ورنہ حقیقت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو میرے اور ائمۂ سلف کے موقف میں سرمو کوئی فرق نہیں ہے۔ میرے ناقدین اگر میری کتاب ''میزان'' کا مطالعہ دقت نظر کے ساتھ کرتے تو اِس چیز کو سمجھ لیتے اور اُنھیں کوئی غلط فہمی نہ ہوتی۔ یہ توقع اب بھی نہیں ہے۔ دین کے سنجیدہ طالب علم، البتہ مستحق ہیں کہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے یہ چند معروضات اُن کی خدمت میں پیش کر دی جائیں:

اولاً، سنت کے ذریعے سے جو دین ملا ہے، اُس کا ایک بڑا حصہ دین ابراہیمی کی تجدید و اصلاح پر مشتمل ہے۔ تمام محققین یہی مانتے ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس میں محض جزوی اضافے کیے ہیں۔ ہرگز نہیں، آپ نے اِس میں مستقل بالذات احکام کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اِس کی مثالیں کوئی شخص اگر چاہے تو ''میزان'' میں دیکھ لے سکتا ہے۔ یہی معاملہ قرآن کا ہے۔ دین کے جن احکام کی ابتدا اُس سے ہوئی ہے، اُن کی تفصیلات ''میزان'' کے کم و بیش تین سو صفحات میں بیان ہوئی ہیں۔ میں اِن میں سے ایک ایک چیز کو ماننے اور اُس پر عمل کرنے کو ایمان کا تقاضا سمجھتا ہوں، اِس لیے یہ الزام بالکل لغو ہے کہ پہلے سے موجود اور متعارف



Marfat.com

چیزوں سے ہٹ کر کوئی نیا حکم دینا یا دین میں کسی نئی بات کا اضافہ کرنا میرے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن مجید کے دائرۂ کار میں شامل ہی نہیں ہے۔

ثانیاً، سنت کی تعیین کے ضوابط کیا ہیں؟ اِن کی وضاحت کے لیے میں نے ''میزان'' کے مقدمہ ''اصول و مبادی'' میں ''مبادی تدبر سنت'' کے عنوان سے ایک پورا باب لکھا ہے۔ یہ سات اصول ہیں۔ اِن کی بنیاد پر ہر صاحب علم کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ سنن کی ایک فہرست اِنھی اصولوں کے مطابق میں نے مرتب کر دی ہے۔ اِس میں کمی بھی ہو سکتی ہے اور بیشی بھی۔ تحقیق کی غلطی واضح ہو جانے کے بعد میں خود بھی وقتاً فوقتاً اِس میں کمی بیشی کرتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی اِس امکان کو رد نہیں کیا ہے۔

ثالثاً، اِس فہرست سے ہٹ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات بھی دین کی حیثیت سے روایتوں میں نقل ہوئے ہیں، اُن میں سے بعض کو میں نے ''تفہیم و تبیین'' اور بعض کو ''اسوۂ حسنہ'' کے ذیل میں رکھا ہے۔ یہی معاملہ عقائد کی تعبیر کا ہے۔ اِس سلسلہ کی جو چیزیں روایتوں میں آئی ہیں، وہ سب میری کتاب ''میزان'' کے باب ''ایمانیات'' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی ''تفہیم و تبیین'' ہے۔ علمی نوعیت کی جو چیزیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے نقل ہوئی ہیں، اُن کے لیے صحیح لفظ میرے نزدیک یہی ہے۔ آپ سے نسبت متحقق ہو تو اس نوعیت کے ہر حکم، ہر فیصلے اور ہر تعبیر کو میں حجت سمجھتا ہوں۔ اِس سے ادنیٰ اختلاف بھی میرے نزدیک ایمان کے منافی ہے۔

[۲۰۰۹ء]



Marfat.com

# اجتہاد

اجتہاد کی اصطلاح ایک حدیث سے پیدا ہوئی ہے۔ ائمۂ حدیث کے نزدیک یہ روایت منقطع ہے، لیکن اِسی کا ایک جملہ ہے جو فقہ اسلامی کی اِس اہم اصطلاح کا ماخذ بن گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ بن جبل کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا تو اُن سے پوچھا: کس طرح فیصلے کرو گے؟ اُنھوں نے عرض کیا: اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کروں گا۔ آپ نے پوچھا: اگر اللہ کی کتاب میں نہ ملے؟ اُنھوں نے جواب دیا: اللہ کے پیغمبر کی سنت میں دیکھوں گا۔ آپ نے پوچھا: اگر وہاں بھی نہ ملے؟ اُنھوں نے جواب دیا: 'أجتهد رأيي، لا آلو'، میں پوری کوشش کر کے اپنی راے قائم کروں گا اور اِس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔*

'أجتهد رأيي' کے یہی الفاظ اِس اصطلاح کا ماخذ ہیں۔ علماے اصول نے اِس کو ہمیشہ اُنھی حدود میں استعمال کیا ہے جو حدیث سے متعین ہوتے ہیں، یعنی اجتہاد صرف اُن امور میں کیا جائے گا جن کے بارے میں قرآن وسنت خاموش ہیں۔ اِس کا اُن امور سے کوئی تعلق نہیں ہے جو قرآن وسنت میں صراحت کے ساتھ بیان ہو گئے

---

* احمد، رقم ۲۱۵۰۲۔



Marfat.com

ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کے نصوص محل تدبر ہیں، وہ محل اجتہاد نہیں ہیں۔ اہل علم اُن کا منشا متعین کرنے کے لیے بار باراُن کی طرف رجوع کر سکتے اور اُن کی تاویل میں اگلوں سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں، مگر اُن کے کسی حکم یا فیصلے کو اپنے اجتہاد سے تبدیل یا معطل نہیں کر سکتے۔

اجتہاد کا دائرہ یہی ہے۔ سیدنا معاذ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمے کی روایت اگر صحیح ہے تو اِس میں آپ نے یہی حقیقت واضح فرمائی ہے۔ چنانچہ پوچھا ہے کہ اگر قرآن میں نہ ملے؟ اگر سنت میں نہ ملے؟ قرآن وسنت میں کوئی چیز مل جاتی ہے تو مسلمان اُس سے انحراف نہیں کر سکتا۔ اُس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ بے چون و چرا اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ و رسول کے سامنے سر اطاعت جھکا دیا جائے۔ خلفاے راشدین کے بعض احکام کو سمجھنے میں دور حاضر کے بعض جلیل القدر مفکرین نے ٹھوکر کھائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن میں سے کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ خدا کے کسی حکم کو تبدیل یا معطل کرنے کی جسارت کرے۔ لوگ جسے تعطیل یا تبدیلی خیال کرتے ہیں، وہ دراصل حکم کے مضمرات و تضمنات ہیں جنھیں خلفاے راشدین نے اپنے عمل سے واضح کر دیا ہے۔ اِس سے تعطیل یا تبدیلی کا جواز پیدا کرنے کے بجاے قرآن وسنت میں تدبر اور اُن کے اسالیب کو سمجھنے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے۔

اِس دائرے کے اندر اجتہاد، البتہ ہوا اور پانی کی طرح ہر مسلمان کی ضرورت



Marfat.com

ہے۔ اِس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ کبھی بند ہوا بھی نہیں۔ بعض لوگوں کی طرف سے اِس اصرار کے باوجود کہ یہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بند ہو چکا ہے، ایسے علما، فقہا اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے ہر زمانے میں اجتہاد کیا ہے اور اِس وقت بھی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم و عقل سے نوازا ہے۔ یہ نعمت انسان کو اِسی لیے دی گئی ہے کہ اپنے معاملات کا فیصلہ اِن کی رہنمائی میں کرے۔ یہ معاملات غیر متعین بھی ہیں اور گوناگوں بھی۔ انسان اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ ہر جگہ براہ راست آسمان کی رہنمائی کا محتاج ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت صرف اُن معاملات میں نازل فرمائی ہے جن میں خود علم و عقل کو رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اُس کے احکام بھی اِسی لیے نہایت محدود ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اجتہاد کیا جائے۔ ترقی کا راز اِسی اجتہاد میں پوشیدہ ہے۔ اِس کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ قومی حیثیت سے وہ طبعی علوم میں سائنسی تحقیق اور معاشرتی علوم میں اجتہاد کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اجتہاد کے کوئی شرائط نہیں ہیں۔ لوگوں کو اجتہاد کرنا چاہیے۔ اُن میں سے ایک غلطی کرے گا تو دوسرے کی تنقید اُسے درست کر دے گی۔ انسان اِسی سے آگے بڑھتا ہے اور اعلیٰ درجے کے مجتہدین بھی اِسی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ تقلید کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ تمام



Marfat.com

شرائط ماننا ضروری ہو جاتے ہیں جو اجتہاد کے لیے بیان کیے جاتے ہیں، اِس لیے کہ اِس صورت میں اصل چیز نفس اجتہاد اور اُس کا استدلال نہیں، بلکہ مجتہد کی شخصیت ہوگی جسے مرجع تقلید مانا جائے گا۔ لیکن صحابہ و تابعین کی طرح عامی و عارف سب اپنے فیصلوں کی بنیاد دلیل پر رکھیں تو مجتہد کو نہیں، بلکہ اجتہاد کو دیکھا جائے گا کہ وہ کس حد تک علم و عقل کے معیارات پر پورا اترتا ہے۔ اِس صورت میں مسلمان تو ایک طرف اگر کوئی غیر مسلم بھی کسی مسئلے کا کوئی معقول حل پیش کر دیتا ہے تو اِس میں اعتراض کی کوئی چیز نہیں ہوگی، اِسے 'ضالۃ المؤمن' سمجھ کر قبول کر لیا جائے گا۔

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ دور حاضر میں سیاست، معیشت، نظم و نسق اور شہریت کے اصول و قواعد سے متعلق زیادہ تر اجتہادات غیر مسلموں نے کیے ہیں اور مسلمان بالعموم اُنھیں تسلیم کیے ہوئے ہیں۔ اِس کی ایک واضح مثال جمہوریت، جمہوری اقدار اور اُن کے تحت قائم ہونے والے اداروں کے ضوابط ہیں۔ جمہوریت کا اصول قرآن نے دیا تھا، مگر مسلمان اِس کے لیے کوئی نظام نہیں بنا سکے۔ یہ نظام غیر مسلموں نے بنایا ہے۔ اِس کے باوجود دیکھ لیجیے کہ علما و فقہا اور بیش تر مذہبی جماعتیں نہ صرف یہ کہ اِس نظام کو تسلیم کرتی ہیں، بلکہ اِس کے فروغ اور بقا کی جدوجہد میں ہمیشہ ہراول کا کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ قرآن و سنت جن معاملات میں خاموش ہیں، اُن میں صحیح رویہ یہی ہے اور اِسی پر قائم رہنا چاہیے۔

[۲۰۱۱ء]



Marfat.com

# اجماع

دین کا تنہا ماخذ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ آپ سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے: ایک قرآن، دوسرے سنت۔ آپ کے بعد اب یہ اِنھی دو چیزوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اِن کے علاوہ تبعاً اگر کوئی چیز خدا کے منشا تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ اجتہاد ہے۔ اِس سے ہم بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ اُن احکام کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو براہ راست نصوص میں بیان نہیں ہوئے، لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُنھی کے اطلاقات ہیں جو لوگوں کی راے اور فہم پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ قیاس اِسی کی ایک قسم ہے۔ قرآن میں اِس کے لیے استنباط کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے جو چیز وجود میں آتی ہے، اُسے فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس کی ابتدا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہادات سے کر دی تھی۔ اخبار آحاد کا ایک بڑا ذخیرہ اِسی کا بیان ہے۔ آپ کے بعد صحابہ و تابعین نے بھی یہ روایت قائم رکھی، لیکن جب فقہا کا دور شروع ہوا تو اِس کے ساتھ ایک چوتھی چیز کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اُس کے بعد سے اب تک بالعموم مانا جاتا ہے کہ اسلامی



Marfat.com

شریعت کا ایک مصدر یہ اجماع بھی ہے۔

دین کے ماخذ میں یہ اضافہ یقیناً ایک بدعت ہے۔ قرآن وسنت کے نصوص میں اِس کے لیے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جا سکتی۔ اِس کے اثرات کا جائزہ لیجیے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اِس سے اسلامی شریعت کی ابدیت مجروح ہوئی اور دور جدید کی نسبت سے اُس کا تعلق (relevance) ثابت کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ برصغیر کے جلیل القدر عالم اور داعی مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

''عام طور پر فقہا نے اجماع (consensus) کو شریعت کا ایک مستقل مصدر قرار دیا ہے، مگر یہ یقینی طور پر ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ شریعت کا مستقل مصدر صرف کوئی نص قطعی ہو سکتا ہے۔ نص قطعی کی غیر موجودگی میں کسی چیز کو شریعت کا مستقل مصدر قرار دینا یقینی طور پر ایک بے بنیاد بات ہے۔ اجماع کی بلاشبہ ایک اہمیت ہے، لیکن وہ اہمیت صرف یہ ہے کہ کسی خاص موقع پر اجماع کسی پیش آمدہ مسئلے کا ایک عملی حل ہوتا ہے۔ یہ حل یقینی طور پر ایک وقتی حل ہوتا ہے، نہ کہ شریعت کا ابدی مصدر۔'' (الرسالہ ۷/۲۰۱۱ء)

فقہا جن دلائل سے اجماع کی حجیت ثابت کرتے ہیں، اُن کی حقیقت اگر کوئی شخص سمجھنا چاہے تو اُسے امام شوکانی کی ''ارشاد الفحول'' دیکھنی چاہیے۔ اُس پر واضح ہو جائے گا کہ یہ کس قدر بے معنی اور غیر متعلق ہیں۔ قرآن مجید کی ایک آیت اور ایک حدیث، البتہ ایسی ہے جس سے استدلال بعض لوگوں کے لیے باعث تردد ہو سکتا



Marfat.com

ہے۔اُس کی حقیقت ہم یہاں واضح کیے دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ، نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا.

(النساء۴:۱۱۵)

''اور جو راہ ہدایت کے پوری طرح اپنے اوپر واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کریں گے اور اُن لوگوں کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کریں گے جو (تم پر) سچے دل سے ایمان لائے ہیں، اُنھیں ہم اُسی راستے پر ڈال دیں گے جس پر وہ خود گئے ہیں اور دوزخ میں جھونکیں گے۔ وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔''

فقہا کے استدلال کی تقریر یہ ہے کہ ایمان والوں کا راستہ چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جائے تو آیت میں اُس پر جہنم کی وعید ہے۔ اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اُن کے راستے کی پیروی ہر شخص پر لازم ہے۔ لہٰذا مسلمان اگر کسی راے یا نقطۂ نظر پر متفق ہو جائیں تو اُس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ہر صاحب ایمان پر واجب ہے کہ اُن کے اِس اجماع کی پیروی کرے۔

یہ استدلال کس قدر بے بنیاد ہے، اِس کو سمجھنے کے لیے آیت کو اُس کے سیاق میں



Marfat.com

رکھ کر دیکھیے۔ پیچھے جن منافقین کی اندرون خانہ سرگوشیوں سے پردہ اٹھایا ہے، اُنھی کے بارے میں فرمایا ہے کہ پیغمبر کی مخالفت کے لیے جو لوگ اپنی ایک الگ پارٹی کھڑی کرنا چاہتے اور اِس طرح ایمان کے بجائے کفر اور منافقت کا طریقہ اختیار کر رہے ہیں، وہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ روے سخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو مسلمانوں کی جماعت میں اُن کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُنھیں تنبیہ فرمائی ہے کہ جن کی وکالت کر رہے ہو، اُن کا یہ 'مشاقة' اُنھیں سیدھا جہنم میں لے جائے گا، اِس لیے کہ یہ اہل ایمان کا طریقہ نہیں ہے اور جو لوگ راہ ہدایت کے پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد کفر اور منافقت کی راہ اختیار کر لیں، اُن کا ٹھکانا جہنم ہی ہو سکتی ہے۔ آیت میں اِسی کفر اور منافقت کے لیے 'غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں مومنین سے مراد صحابۂ کرام ہیں، جنھوں نے حق کو پالیا تو اُس کے بعد پھر کبھی خدا کے پیغمبر سے بد عہدی، بے وفائی، مخالفت اور گریز و فرار کا رویہ اختیار نہیں کیا، بلکہ پورے اخلاص کے ساتھ آپ کی اتباع کی اور جو حکم دیا گیا، اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہے۔ ایمان و اخلاص، اتباع و اطاعت اور تسلیم و انقیاد کا یہی رویہ ہے جسے آیت میں 'سَبِیْلُ الْمُؤْمِنِیْنَ' سے تعبیر کیا ہے۔ اِسے چھوڑ کر جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے، وہ 'غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ' ہے اور اِسی کے اختیار کرنے والے ہیں جنھیں جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ اِس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اہل ایمان کی



Marfat.com

[illegible]

[illegible]

[illegible] امتی علی ضلالة [illegible]

[illegible] حدیث [illegible]

[illegible] پا سکی [illegible]

[illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الواقع اپنی امت کو یہ بشارت دی ہے،

لیکن اس سے [illegible] کوئی خطا بھی نہیں ہو سکتی؟ حقیقت یہ ہے کہ خطا

---

[illegible] ۲۱۶۔



Marfat.com

اور ضلالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور حدیث میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، اُس کا تعلق ضلالت سے ہے، خطا سے نہیں ہے۔ پوری امت کسی ضلالت پر جمع ہو جائے، یہ ناممکن ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ دین کے معاملے میں ہدایت و ضلالت کا فرق اتمام حجت کے درجے میں واضح کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا عقلاً محال ہے کہ امت کے تمام علما، مجتہدین اور ارباب حل و عقد کسی شرک کو شرک سمجھتے ہوئے اُس پر جمع ہو جائیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت کا انکار کر دیں یا آخرت میں جواب دہی کے منکر ہو جائیں یا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قربانی جیسے احکام سے انحراف اختیار کر لیں۔ اِس طرح کی چیزیں اب امت کے لیے من جملہ بدیہیات ہیں۔ اِن سے انحراف پر اجماع نہیں ہو سکتا۔ اِس کے برخلاف جو چیزیں محل تدبر یا محل اجتہاد ہیں، اُن کے سمجھنے میں غلطی ہو سکتی ہے اور امت کے سب لوگ اُس غلطی پر جمع بھی ہو سکتے ہیں۔ عقل و نقل میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر اِسے ممتنع قرار دیا جا سکے۔ چنانچہ حدیث کی نسبت اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح بھی ہے تو اُس کے الفاظ سے واضح ہے کہ آپ کی یہ بشارت ضلالت پر اجماع سے متعلق ہے اور ضلالت کے بارے میں یہ بات یقیناً کہی جا سکتی ہے کہ مسلمان اُس پر کبھی جمع نہیں ہوں گے۔ فکر و اجتہاد اور فہم و تدبر کی کسی غلطی پر اجماع سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۲۰۱۱ء]



Marfat.com

# حدیث کی تدوین جدید

[جمہوریہ ترکی میں حدیث کی تدوین جدید سے
متعلق ایک استفسار کے جواب میں لکھا گیا]

حدیث سے متعلق کسی کام کو سمجھنے کے لیے اِس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ دین کا تنہا ماخذ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔آپ سے یہ دین دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے: ایک قرآن، دوسرے سنت۔ یہ بالکل یقینی ہیں اور اپنے ثبوت کے لیے کسی تحقیق کے محتاج نہیں ہیں۔ اِنھیں مسلمانوں نے نسلاً بعد نسلٍ اپنے اجماع اور تواتر سے منتقل کیا ہے۔اِس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کی ہر نسل کے لوگوں نے بغیر کسی اختلاف کے پچھلوں سے لیا اور اگلوں تک پہنچا دیا ہے اور زمانۂ رسالت سے لے کر آج تک یہ سلسلہ اِسی طرح قائم ہے۔

پورا دین اِنھی دو میں محصور ہے اور اُس کے تمام احکام ہم اِنھی سے اخذ کرتے ہیں۔ اِس میں بعض اوقات کوئی مشکل پیش آجاتی ہے۔ پھر جن معاملات کو ہمارے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے، اُن میں بھی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اِس کے لیے دین کے علما کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر تھے، اِس لیے دین کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے عالم، بلکہ سب عالموں کے



Marfat.com

امام بھی آپ ہی تھے۔ دین کے دوسرے عالموں سے الگ آپ کے علم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ آپ کا علم بے خطا تھا، اِس لیے کہ اُس کو وحی کی تائید و تصویب حاصل تھی۔ یہ علم اگر کہیں موجود ہو تو ہر مسلمان چاہے گا کہ قرآن و سنت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اِسی سے رہنمائی حاصل کرے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ علم موجود ہے اور اِس کا ایک بڑا حصہ ہم تک پہنچ گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ علم آپ کے صحابہؓ نے حاصل کیا تھا، لیکن اِس کو آگے بیان کرنا چونکہ بڑی ذمہ داری کا کام تھا، اِس لیے بعض نے احتیاط برتی اور بعض نے حوصلہ کر کے بیان کر دیا۔ اِس میں وہ چیزیں بھی تھیں جنھیں وہ آپ کی زبان سے سنتے یا آپ کے عمل میں دیکھتے تھے اور وہ بھی جو آپ کے سامنے کی جاتی تھیں اور آپ اُن سے منع نہیں فرماتے تھے۔ یہی سارا علم ہے جسے 'حدیث' کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح کو جاننے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔ اِس سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ اُسی دین کی شرح و وضاحت اور اُس پر عمل کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا بیان ہے جو آپ نے قرآن و سنت کی صورت میں اپنے ماننے والوں کو دیا ہے۔

یہ ہم تک کس طرح پہنچا ہے؟ تاریخ بتاتی ہے کہ اِسے حدیثوں کی صورت میں سب سے پہلے صحابہ نے لوگوں تک پہنچایا۔ پھر جن لوگوں نے یہ حدیثیں اُن سے سنیں، اُنھوں نے دوسروں کو سنائیں۔ یہ زبانی بھی سنائی گئیں اور بعض اوقات لکھ کر بھی دی گئیں۔ ایک دو نسلوں تک یہ سلسلہ اِسی طرح چلا، لیکن پھر صاف محسوس ہونے



Marfat.com

لگا کہ اِن کے بیان کرنے میں کہیں کہیں غلطیاں ہو رہی ہیں اور کچھ لوگ دانستہ اِن میں جھوٹ کی ملاوٹ بھی کر رہے ہیں۔ یہی موقع ہے، جب اللہ کے کچھ بندے اٹھے اور اُنھوں نے اِن حدیثوں کی تحقیق کرنا شروع کی۔ اِنھیں 'محدثین' کہا جاتا ہے۔ یہ بڑے غیر معمولی لوگ تھے۔ اِنھوں نے ایک ایک روایت اور اُس کے بیان کرنے والوں کی تحقیق کر کے، جس حد تک ممکن تھا، غلط اور صحیح کی نشان دہی کی اور جھوٹ کو سچ سے الگ کر دیا۔ پھر اِنھی میں سے بعض نے ایسی کتابیں بھی مرتب کر دیں جن کے بارے میں بڑی حد تک اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں، وہ بیش تر حضور ہی کا علم ہے جو روایت کرنے والوں نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ علم کی زبان میں اِنھیں 'اخبار آحاد' کہتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِنھیں صرف گنتی کے لوگوں نے بیان کیا ہے، قرآن وسنت کی طرح یہ اجماع اور تواتر سے منتقل نہیں ہوئی ہیں۔ چنانچہ بالعموم تسلیم کیا جاتا ہے کہ اِن سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا، اُسے زیادہ سے زیادہ ظن غالب قرار دیا جا سکتا ہے۔

حدیث کی جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے، وہ سب اپنی جگہ اہم ہیں، مگر امام مالک، امام بخاری اور امام مسلم کی کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور بہت مستند خیال کی جاتی ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بڑی تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اِن کے مرتب کرنے والوں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اِس علم کے ماہرین جانتے ہیں کہ اُن سے تحقیق میں غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ اِسی بنا پر وہ حدیث کی کتابوں کو برابر جانچتے پرکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کسی حدیث کے بیان کرنے والوں کو اگر



Marfat.com

سیرت و کردار اور حفظ و اتقان کے لحاظ سے قابل اعتماد نہیں پاتے یا آپس میں اُن کی ملاقات کا امکان نہیں دیکھتے یا اُن کی بیان کردہ حدیث کے مضمون میں دیکھتے ہیں کہ کوئی بات قرآن و سنت کے خلاف ہے یا علم و عقل کے مسلمات کے خلاف ہے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ آں حضرت کی بات نہیں ہوسکتی۔ یہ غلطی سے آپ کی طرف منسوب ہوگئی ہے۔ یہی معاملہ اِن حدیثوں کے فہم اور اِن کی شرح و وضاحت کا ہے۔ اہل علم اِس معاملے میں بھی اپنی تعبیرات اِسی طرح پیش کرتے رہتے ہیں۔

یہ کام ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ ابھی پچھلی صدی میں علامہ ناصر الدین البانی نے اِس سلسلے میں بڑی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے اور حدیث کی اکثر کتابوں پر ازسرِنو تحقیق کرکے اُن کے صحیح اور سقیم کو ایک مرتبہ پھر الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جمہوریہ ترکی کے اہل علم نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے، اُس کی نوعیت بھی کم و بیش یہی ہے۔ اُن کے نتائج فکر و تحقیق ابھی سامنے نہیں آئے، لہٰذا اُن کے بارے میں تو کوئی راے نہیں دی جا سکتی، لیکن کام کی نوعیت سے متعلق جو تفصیلات معلوم ہیں، اُن میں بظاہر کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے۔ حدیث کی جو حیثیت اوپر بیان ہوئی ہے، اُس کو پیش نظر رکھ کر اگر اِس علم کے مسلمہ قواعد کے مطابق اُس کا جائزہ لیا جائے گا یا اُس کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے گا یا اُس کا مدعا سمجھنے اور اُس کے وقتی اور دائمی کو الگ الگ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اِس میں اعتراض کی کیا بات ہوسکتی ہے؟ علم و تحقیق کا دروازہ کسی دور میں اور کسی حال میں بھی بند نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کام میں اگر کچھ



Marfat.com

غلطیاں بھی ہوں گی تو تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ دوسرے اہل علم اپنی تنقیدات سے اُن کی نشان دہی کر دیں گے۔ علم کی ترقی کا اِس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ لوگوں کو آزادی کے ساتھ کام کرنے دیا جائے۔ نئی راہیں اِسی سے کھلتی ہیں اور اگلوں نے اگر کہیں غلطی کی ہے تو اُس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ ترک اہل علم کی کاوش کو اِسی نگاہ سے دیکھنا چاہیے اور اُن لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جو مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ادارے کی صورت میں یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اُن کا کام اگر معیار کے مطابق ہوا تو یہ ایک عظیم خدمت ہو گی اور اگر کم عیار ثابت ہوا تو بے وقعت ہو کر تاریخ کے کوڑے دان کی نذر ہو جائے گا۔ علم کی عدالت بڑی بے رحم ہے۔ وہ جلد یا بدیر اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے۔ اِس طرح کے معاملات میں اُسی کے فیصلوں کا انتظار کرنا چاہیے۔

[۲۰۱۳ء]

# ہماری دعوت

دین اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اُس نے پہلے انسان کی فطرت میں الہام فرمائی



Marfat.com

اور اِس کے بعد اُس کی تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسان کو دی ہے۔ اِس سلسلہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ دین کا تنہا ماخذ اب آپ ہی کی ذات والا صفات ہے اور دین حق اب وہی ہے جسے آپ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے دین قرار دیں۔[1]

دنیا کے تمام انسانوں کو ہم اِس دین پر ایمان اور اِس کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تزکیے کی دعوت دیتے ہیں۔ جو لوگ اِس دعوت کو قبول کر لیں، اُن کا صلہ خدا کی جنت ہے جس کی وسعت پوری کائنات کی وسعت ہے؛ جس میں زندگی کے ساتھ موت، لذت کے ساتھ الم، خوشی کے ساتھ غم، اطمینان کے ساتھ اضطراب، راحت کے ساتھ تکلیف اور نعمت کے ساتھ نقمت کا کوئی تصور نہیں ہے؛ جس کا آرام دائمی ہے، جس کی لذت بے انتہا ہے، جس کے شب و روز جاوداں ہیں، جس کی سلامتی ابدی ہے، جس کی مسرت غیر فانی ہے، جس کا جمال لازوال اور کمال بے نہایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے اِس میں وہ کچھ مہیا کیا ہے جسے نہ آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اُس کا خیال کبھی گزرا ہے۔[2]

اِس وقت جو لوگ اِس دین کے ماننے والے ہیں، اُنھیں ہم دعوت دیتے ہیں کہ خدا کی اِس جنت کو پانے کے لیے اپنے عمل کو بھی وہ اپنے ایمان کے مطابق کر لیں، خدا

---

[1] الجمعہ ۶۲: ۲۔

[2] الاعلیٰ ۸۷: ۱۴-۱۷۔



Marfat.com

اور اُس کے بندوں کے حقوق پوری دیانت اور پورے اخلاص کے ساتھ ادا کریں اور کسی کے جان و مال اور آبرو کے خلاف کوئی زیادتی نہ کریں[3]۔

ہم اُنھیں دعوت دیتے ہیں کہ اپنے ماحول اور اپنے دائرۂ عمل میں وہ ایک دوسرے کو بھلائی کی نصیحت کریں اور برائی سے روکیں۔ یہ اُن کا فرض ہے جو اُن کے پروردگار نے اُن پر عائد کیا ہے۔ یہ فرض باپ کو بیٹے کے لیے اور بیٹے کو باپ کے لیے، شوہر کو بیوی کے لیے اور بیوی کو شوہر کے لیے، بھائی کو بہن کے لیے اور بہن کو بھائی کے لیے، دوست کو دوست کے لیے اور پڑوسی کو پڑوسی کے لیے، غرض یہ کہ ہر شخص کو اپنے ساتھ متعلق ہر شخص کے لیے ادا کرنا ہے۔ چنانچہ وہ جہاں یہ دیکھیں کہ اُن کے متعلقین میں سے کسی نے کوئی خلاف حق طریقہ اختیار کیا ہے، اُنھیں چاہیے کہ اپنے علم اور اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق اُسے راستی کی روش اپنانے کی نصیحت کریں[4]۔

دین و دنیا کے کسی معاملے میں اُن کے جذبات، تعصّبات، مفادات اور خواہشیں اگر اُنھیں انصاف کی راہ سے ہٹانا چاہیں تو حق و انصاف پر قائم رہیں، بلکہ یہ اگر گواہی کا مطالبہ کریں تو جان کی بازی لگا کر اِن کا یہ مطالبہ پورا کریں۔ حق کہیں، حق کے سامنے اپنا سر جھکا دیں، انصاف کی گواہی دیں اور اپنے عقیدہ و عمل میں انصاف کے

---

[3] النحل ۱۶:۹۰۔

[4] التوبہ ۹:۷۱۔



Marfat.com

سوا کبھی کوئی چیز اختیار نہ کریں۔[5]

اُنھیں مذہبی جبر (persecution) کا نشانہ بنایا جائے تو تشدد کے جواب میں تشدد کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے صبر کریں[6] اور ممکن ہو تو جس جگہ یہ صورت حال پیش آ جائے، اُس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائیں، جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکیں۔[7]

مدرسۂ فراہی کے اکابر اہل علم نے خدا کی توفیق سے دین حق کو دور حاضر میں فقہ و کلام اور فلسفہ و تصوف کی ہر آمیزش سے الگ کر کے بے کم و کاست اور خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر پیش کر دیا ہے۔ اِس دین کی نشر و اشاعت، اِس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اِس کی روشنی میں مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تشکیل جدید ایک جہاد کبیر ہے۔ ہم اُنھیں دعوت دیتے ہیں کہ اپنی تائید، اپنے وقت اور اپنے وسائل سے وہ اِس جہاد میں ہماری مدد کریں۔ یہ خدا کے سچے دین کی نصرت ہے جس سے زیادہ کوئی چیز بھی بندۂ مومن کو عزیز نہیں ہونی چاہیے۔[8]

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ، کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ

---

[5] النساء۴:۱۳۵۔ المائدہ۵:۸۔

[6] حٰم السجدہ۴۱:۳۴-۳۵۔

[7] النساء۴:۹۷۔

[8] التوبہ۹:۲۴۔



Marfat.com

مَرۡیَمَ لِلۡحَوَارِیّٖنَ: مَنۡ اَنۡصَارِیۡٓ اِلَی اللّٰہِ؟ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ: نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ. (الصف ۶۱:۱۴)

''ایمان والو، اللہ کے مددگار بنو، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا تھا: کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم اللہ کے مددگار ہیں۔''

[۲۰۱۲ء]

# مسلمانوں کا زوال

مسلمان کم وبیش ایک ہزار سال تک دنیا کی ایک بڑی طاقت رہے ہیں۔ علم و حکمت، تدبیر وسیاست اور دولت وحشمت میں کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ وہ پوری دنیا پر حکومت کر رہے تھے۔ یہ بادشاہی خدا نے اُنھیں دی تھی اور خدا ہی نے اُن سے چھین لی ہے۔ قوموں کے عروج وزوال کے بارے میں خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ سرفرازی کے لیے تو جسے چاہتا ہے، اپنے قانون ابتلا کے مطابق منتخب کر لیتا ہے، لیکن جب ایک مرتبہ منتخب کر لیتا ہے تو اُس کی یہ حالت اُسی وقت تبدیل کرتا ہے، جب علم و اخلاق کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو پوری طرح پستی میں گرا دیتی ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ ایک دوسرا معاملہ بھی ہوا ہے۔ اُن کی اصل ہمیشہ عرب رہے



Marfat.com

ہیں۔ وہ زیادہ تر بنی اسمٰعیل ہیں اور بنی اسمٰعیل کے بارے میں معلوم ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت ہیں۔ چنانچہ اُن پر اُس سنت الٰہی کا اطلاق بھی ہوتا ہے جو قرآن میں ذریت ابراہیم سے متعلق بیان ہوئی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ یہ لوگ اگر حق پر قائم ہوں تو انھیں قوموں کی امامت حاصل ہوگی اور اُس سے انحراف کریں تو اِس منصب سے معزول کر کے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیے جائیں گے۔

چنانچہ مسلمان اگر اِس عذاب میں مبتلا ہیں تو یہ کوئی اَلل ٹپ معاملہ نہیں ہے اور نہ دوسروں کی سازش کے نتیجے میں ہوا ہے، جس طرح کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی زعما بالعموم کہتے ہیں۔ اِس کے متعین اسباب ہیں، یہ اُنھی کے تحت ہوا ہے۔ اِس کے پیچھے خدا کا قانون عزل ونصب کارفرما ہے۔ اُس کی روشنی میں اِسے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو زوال کے اسباب بالکل واضح ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔

یہ بنیادی طور پر تین ہیں:

اولاً، مسلمان کتاب الٰہی کے حامل بنائے گئے تھے۔ یہ محض کتاب نہیں ہے۔ یہ خدا کی میزان ہے جو اِس لیے نازل کی گئی ہے کہ دین کے معاملے میں تمام حق و باطل کا فیصلہ اِسی پر تول کر کیا جائے۔ مسلمان اپنے تمام اختلافات اِس کے سامنے پیش کریں اور جو فیصلہ اِس کی بارگاہ سے صادر ہو جائے، بے چون و چرا اُسے قبول کر لیں۔ یہ اُن کے علم و عمل کا مرکز ہو۔ ایمان و عقیدہ اور دین و شریعت کے تمام معاملات میں یہی مرجع بنے، ہر تحقیق، ہر رائے اور ہر نقطۂ نظر کو ہمیشہ اِس کے تابع رکھا جائے، یہاں تک کہ خدا کے پیغمبروں کی کوئی بات بھی اِس پر حکم نہ سمجھی جائے، بلکہ ہر چیز پر اِسی کو حکم مانا



Marfat.com

جائے۔ گذشتہ کئی صدیوں سے مسلمان بدقسمتی سے کتاب الٰہی کی یہ حیثیت اپنے علم و عمل میں برقرار نہیں رکھ سکے۔ چنانچہ اقبال کے الفاظ میں 'خوار از مہجوریِ قرآں شدی'* کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں۔

ثانیاً، دنیا عالم اسباب ہے۔ یہ اسباب زیادہ تر سائنسی علوم میں انسان کی مہارت سے پیدا ہوتے ہیں۔ خدا نے اپنے جو خزانے زمین و آسمان میں مدفون رکھے ہوئے ہیں، وہ اِسی مہارت سے نکالے جا سکتے ہیں۔ انسان کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ عروج و زوال تو ایک طرف، اُس کے مرنے اور جینے کا انحصار بھی بیش تر اِنھی علوم میں مہارت پر رہا ہے۔ آگ کی دریافت اور پہیے کی ایجاد سے لے کر دور جدید کے حیرت انگیز انکشافات تک یہ حقیقت تاریخ کے ہر صفحے پر ثبت ہے۔ مسلمانوں کو اِن علوم سے دل چسپی تو ہوئی، مگر اُن کے ذہین عناصر کا اشتغال زیادہ تر فلسفہ اور تصوف سے رہا، حالاں کہ اِس کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ فلسفہ و تصوف جن سوالات سے بحث کرتے ہیں، خدا کی کتاب حتمی حجت کی حیثیت سے اُن کا جواب لے کر نازل ہو چکی تھی۔ اِن علوم کے ساتھ اشتغال نے مسلمانوں کو خدا کی کتاب سے بھی بے گانہ رکھا اور سائنسی علوم سے بھی۔ پرانے مدرسوں میں وہ اب بھی فلسفہ و تصوف کے وہی مباحث دہرا رہے ہیں جو 'علم لا ینفع'** کی بہترین مثال ہیں۔ چنانچہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور وہ تصویر حیرت بنے ہوئے ہیں۔

* تم قرآن کو چھوڑ کر خوار ہوئے ہو۔

** وہ علم جو نفع نہ دے۔



Marfat.com

ثالثاً، مسلمانوں نے اپنی اخلاقی تربیت سے شدید غفلت برتی ہے۔ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ جھوٹ، بددیانتی، غبن، خیانت، چوری، غصب، ملاوٹ، سودخوری، ناپ تول میں کمی، بہتان طرازی، وعدے کی خلاف ورزی، سفلی علوم سے اشتغال، ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق، قبروں کی پرستش، مشرکانہ رسوم، بے ہودہ تفریحات اور اِس نوعیت کے دوسرے جرائم اُن کے معاشروں میں اِس قدر عام ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کے یہی جرائم تھے جن کی بنا پر خدا کے نبیوں نے اُن پر لعنت کی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے خدا کی رحمت سے دور کر دیے گئے۔ مسلمان بھی اِسی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ اُن کی تصویر دیکھنا ہو تو انجیل کے صفحات میں دیکھ لی جا سکتی ہے، جہاں سیدنا مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل اور اُن کے علما و احبار، دانش وروں اور ارباب حل و عقد کی فرد قرارداد جرم بیان کی ہے۔ اُن کے در و دیوار، گلیاں اور بازار، سب پکارتے ہیں: یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود۔

مسلمانوں کا زوال اِن اسباب سے ہوا ہے۔ وہ انحطاط و زوال کی اِس حالت سے نکلنا چاہتے ہیں تو نہ جہاد و قتال سے کچھ ہو سکتا ہے، نہ مزاحمت کی تحریکوں سے۔ سرنگاپٹم سے افغانستان تک پچھلے دو سو سال کی تاریخ اِس کی گواہی دیتی ہے۔ اِس سے نکلنے کے لیے اُنھیں وہ اسباب دور کرنا ہوں گے جو اُن کے زوال کا باعث بنے ہیں، ورنہ یہی ذلت و نکبت اور محکومی ہمیشہ اُن کا مقدر رہے گی۔ خدا کا قانون بے لاگ ہے۔ وہ اُس کی زد میں آ چکے ہیں۔ وہ جب دوسروں سے لڑ کر اِس سے نکلنا چاہتے ہیں



Marfat.com

تو در حقیقت خدا سے لڑ رہے ہوتے ہیں جس نے اپنے 'اُولِی بَأسٍ شَدِیْد' بندے اُن پر مسلط کر دیے ہیں۔ یہ خدا کا عذاب ہے۔ اِس سے بچنے کے راستے وہ نہیں ہیں جو اُن کے مذہبی اور سیاسی رہنما اور بزعم خود مجاہدین اُنھیں بتا رہے ہیں۔ اِن راستوں پر چل کر نہ وہ بڑی طاقتوں کا اثر و رسوخ اپنے ملکوں میں ختم کر سکتے ہیں، نہ فلسطین اور کشمیر سے یہود و ہنود کو نکال سکتے ہیں۔ وہ قرآن اور بائیبل، دونوں میں انبیا علیہم السلام کی دعوت کا مطالعہ کریں۔ خدا کے پیغمبر بابل کی اسیری کے زمانے میں آئے ہوں یا رومی حکمرانوں کے دور میں، اُنھوں نے کبھی یہ راستے اپنی قوم کو نہیں بتائے۔ وہ اپنی قوم کے جرائم اُسے بتاتے تھے، یہ دوسروں کے جرائم ڈھونڈنے اور اُنھیں بُرا بھلا سنانے کو اپنا ہنر سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اُسے ابتدا سے انتہا تک دیکھ لیجیے۔ بابل اور روم کے حکمرانوں کے خلاف آپ مذمت کا ایک لفظ اُس میں نہیں دیکھیں گے، بلکہ ہر جگہ بنی اسرائیل کی فرد قرارداد جرم دیکھیں گے۔ یہی فرد جرم اِس وقت مسلمانوں کو بھی سنانے کی ضرورت ہے، اِس لیے کہ خدا کا جو وعدہ بنی اسرائیل سے تھا، وہی مسلمانوں سے ہے کہ تم میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے ساتھ اپنے عہد کو پورا کروں گا۔ میری رحمت منتظر ہے، لیکن اِنھی راستوں پر چلتے رہو گے تو میں بھی اُسی راستے پر چلوں گا جس پر چل رہا ہوں اور میرے عذاب کا تازیانہ تمھاری پیٹھ پر برستا رہے گا۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار۔

[۲۰۱۰ء]



Marfat.com

# مسئلہء قومیت

رنگ، نسل، زبان، تہذیبی روایات اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم ہونے کا احساس انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، لیکن اپنے رشتہ داروں سے جو قربت محسوس ہوتی ہے، وہ دوسرے انسانوں سے محسوس نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ قوم کا ہے۔ انسان جس طرح اپنی شخصیت، خاندان اور اعزہ واقربا کے حوالے سے اپنی انفرادیت کا اظہار کرتا اور دوسروں سے آگے رہنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے، اِسی طرح قوم کے حوالے سے بھی محسوس کرتا ہے۔ اپنی شناخت کا یہی احساس ہے جس سے لوگ مل کر مشترک معاشرت بناتے اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں۔ قرآن نے اِسے تعارف کے لفظ سے تعبیر کیا اور فرمایا ہے کہ شعوب وقبائل اِسی کے پیش نظر وجود میں آئے ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اُس کے نزدیک جو چیز قابل اعتراض ہے، وہ قومیت کی بنیاد پر تکبر ہے، دوسری قوموں سے نفرت ہے، اُنھیں کم تر سمجھ کر مغلوب کرنے، اُن کے حقوق غصب کرنے، اُن کے اور اپنے درمیان اونچ نیچ اور شریف اور کمین کے امتیازات قائم کرنے، اُنھیں ذلیل وحقیر سمجھنے اور اُن کا استحصال کرنے کے داعیات



Marfat.com

ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِن میں سے ہر چیز کو وہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور انسانیت کے خلاف بدترین جرم قرار دیتا ہے، لیکن قومیت کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اُس کی اُن تمام بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے جو علم سیاست میں بالعموم اُس کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ قوموں کے مابین مسابقت کے جذبے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اُس کے شایستہ اظہار پر بھی اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہ اگر اپنی قوم کے حوالے سے اپنا تعارف کرائیں، حقوق کا مطالبہ کریں یا اپنی کوئی الگ قومی ریاست قائم کرنا چاہیں تو اِسے بھی وہ ناجائز نہیں کہتا۔ لہٰذا یہ نقطۂ نظر کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد بھی اسلام ہی ہے، کسی طرح درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن نے کسی جگہ یہ نہیں کہا کہ مسلمان ایک قوم ہیں یا اُنھیں ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر اقوام و ملل کا وجود وہ تسلیم کرتا ہے۔ اُس نے جو بات کہی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں: 'اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ' (الحجرات ۴۹: ۱۰)۔ قرآن کی رو سے مسلمانوں کا باہمی رشتہ قومیت کا نہیں، بلکہ اخوت کا ہے۔ وہ دسیوں ریاستوں اور بیسیوں ممالک میں تقسیم ہونے کے باوجود ایمان کے رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اِس لیے یہ تقاضا تو اُن سے کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ اپنے بھائیوں کے حالات کی خبر رکھیں، اُن کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں اُن کے کام آئیں، وہ مظلوم ہوں تو اُن کی مدد کریں، معاشی اور معاشرتی روابط کے لیے اُنھیں ترجیح دیں اور اُن پر اپنے دروازے کسی حال میں بند نہ کریں، مگر یہ تقاضا نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی قومی ریاستوں



Marfat.com

اور قومی شناخت سے دست بردار ہو کر لازماً ایک ہی قوم اور ایک ہی ریاست بن جائیں۔ وہ جس طرح اپنی الگ الگ قومی ریاستیں قائم کر سکتے ہیں، اسی طرح دین و شریعت پر عمل کی آزادی ہو تو غیر مسلم اکثریت کی ریاستوں میں شہری کی حیثیت سے اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن کر رہ بھی سکتے ہیں۔ اِن میں سے کوئی چیز قرآن وسنت کی رو سے ناجائز نہیں ہے۔

[۲۰۰۸ء]

# اسلامی تہذیب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جو تہذیب دنیا میں پیدا ہوئی، اُس کی بنیادی قدر عبودیت تھی۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ معاشرہ خدا پر ایمان اور اُس کے ساتھ بندگی کے تعلق کو محور و مرکز کی حیثیت دیتا اور زندگی کے تمام معاملات کو اِسی محور سے متعلق کرتا ہے۔ آزادی اُس میں بھی ایک بڑی قدر تھی، لیکن وہ بندگی سے آزاد نہیں تھی۔ اِس تہذیب کے اخلاقی تصورات میں کوئی ابہام نہ تھا۔ وہ خدا کے الہام سے تصویب حاصل کرتے تھے۔ اِس کے شاعر، ادیب، فلسفی، حکیم، سائنس دان اور ارباب سیاست، سب اِس معاملے میں بالکل واضح تھے اور اپنے نتائج فکر بالعموم اِسی حوالے سے پیش



Marfat.com

کرتے تھے۔ چنانچہ اس سے جو تہذیبی روایت قائم ہوئی اور کم وبیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے اجتماعی وجود کا احاطہ کیے رہی، اُس کے عناصر یہ تین تھے:

ایک حفظ فروج،

دوسرے حفظ مراتب،

تیسرے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

حفظ فروج کے معنی یہ تھے کہ لوگوں کو اِس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ معاشرے میں بدکاری کو عام کریں، مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے علانیہ جنسی تعلقات پیدا کریں، اِسی تعلق کی بنا پر اکٹھے رہیں یا جنسی اعضا اور جنسی معاملات دوسروں کے سامنے کھولیں۔

حفظ مراتب کے معنی یہ تھے کہ خلقت کے لحاظ سے تمام انسان، بے شک برابر ہیں، مگر رشتوں میں برابری نہیں ہے۔ چھوٹوں کے لیے بڑے، اولاد کے لیے والدین، شاگردوں کے لیے استاد اور بیوی کے لیے شوہر برتری کے مقام پر ہیں۔ اِن کے لیے تادیب وتنبیہ کا حق مانا جائے گا اور اِن کی عزت اور اِن کا احترام ہر حال میں قائم رکھا جائے گا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی یہ تھے کہ معاشرہ خیر وشر کے مسلمات سے بے تعلق نہیں رہے گا۔ انسانی فطرت میں جو چیزیں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور جنھیں پوری انسانیت مانتی ہے، اُن کی تلقین کی جائے گی، اور جن چیزوں کو فطرت شر سمجھتی



Marfat.com

اور پوری انسانیت جن سے نفرت کرتی ہے، اُن سے لوگوں کو ہر حال میں روکا جائے گا۔

یہ تہذیبی روایت انسانیت کا حسن اور اُس کے چہرے کا جمال تھی۔ اِس کا زوال انسانیت کا زوال ہے۔ انسانی حقوق، جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے لیے دورِ جدید کا انسان جتنا حساس ہے، اے کاش وہ اِس روایت کی بازیافت کے لیے بھی اتنا ہی حساس ہو جائے۔

[۲۰۰۸ء]

# اسلامی حکومت

انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ حکومت قائم کر کے زندگی بسر کرتا ہے۔ اِس کا پہلا ظہور اُس وقت ہوا، جب لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے قبیلوں کے لیے سرداروں کا انتخاب کریں گے۔ پھر یہی سردار جب دوسرے قبیلوں پر حملہ کر کے اپنی سرداری اُن پر بھی مسلط کر دینے میں کامیاب ہو گئے تو مفتوحہ علاقوں کے مالک بن بیٹھے اور بتدریج اِس نے خاندانی بادشاہی کی صورت اختیار کر لی۔ بعد کے زمانوں میں اِنھی بادشاہوں نے بڑے بڑے فاتحین کی حیثیت سے سلطنت ہاے عام کی بنیاد ڈالی اور وہ حکومتیں وجود میں آئیں جنھیں ہم ساسانی سلطنت، رومی سلطنت اور اِس طرح کی بعض دوسری



Marfat.com

سلطنتوں کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ سلطنتیں تو اب ختم ہو چکی ہیں، مگر بادشاہتیں کئی جگہ باقی ہیں اور زیادہ تر آئینی بادشاہتوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ چند ملکوں کو چھوڑ کر ہر جگہ یہی صورت حال ہے۔ اِن مستثنیات میں ایک سعودی عرب کی بادشاہت ہے۔ یہ ابھی تک اپنے اصل جاہ وجلال کے ساتھ قائم ہے۔ اِس طرح کی بادشاہت میں قانون کیا ہوگا؟ اِس کا فیصلہ بادشاہ اور اُس کے اعیان واکابر کرتے ہیں۔ سعودی حکومت محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی۔ چنانچہ اپنی تاسیس کے پہلے دن ہی سے اُس نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ اُس کا ملکی قانون اسلامی شریعت ہے۔ سنی علما کی بڑی اکثریت بادشاہت کو خلاف شریعت نہیں سمجھتی اور شریعت کی جو تعبیر سعودی حکومت نے اختیار کر رکھی ہے، اُس سے فی الجملہ متفق بھی ہے۔ اِس لیے اُن کے خیال میں یہ ایک اسلامی حکومت ہے اور اِسی حیثیت سے وہ اِس کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرتے ہیں۔

دور حاضر میں اسلام کا جو انقلابی فکر پیدا ہوا، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ صرف صالحین کی منظم اقلیت ہے جو لوگوں پر حکومت کا حق رکھتی ہے۔ خدا سے پھرے ہوئے لوگ اگر حکومت کر رہے ہیں تو درحقیقت غاصب ہیں۔ صالحین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اُن سے اپنا یہ حق واپس لینے کی جدوجہد کریں۔ شیعہ تعبیر میں یہی چیز معصومین کی حکومت اور ولایت فقیہ جیسے تصورات کی صورت میں پہلے سے موجود تھی۔ چنانچہ سنی اور شیعہ علما نے بھی جگہ جگہ اپنی جماعتیں اِسی مقصد سے قائم کر رکھی ہیں اور نئے



Marfat.com

تعلیم یافتہ لوگ بھی کئی ملکوں میں صالحین کی یہ منظم اقلیت پیدا کر کے اپنی تعبیر کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدو جہد کر رہے ہیں۔ اِن میں سے بعض جگہ یہ جدو جہد کامیابی سے ہم کنار بھی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ایران میں جہاں امام خمینی کی قیادت میں علما اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور گذشتہ ربع صدی سے پوری طاقت کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں۔ اِسی طرح افغانستان میں جہاں حکومت پاکستان کی مدد اور تعاون سے اِنھی علما کے شاگردوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی جو بد قسمتی سے ۱۱ر ستمبر کے حادثے کی نذر ہو گئی اور اب اپنے احیا کے لیے نیٹو ممالک کی فوجوں کے ساتھ برسر جنگ ہے۔

اِس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کیا چاہتا ہے؟ قرآن وحدیث کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا اصل مخاطب فرد ہے۔ وہ اُس کے دل و دماغ پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اُسی کو پابند کرتا ہے کہ اپنے پورے وجود پر خدا کی حاکمیت تسلیم کرے۔ اُس کا خدا جس طرح انسانوں کا رب اور انسانوں کا معبود ہے، اُسی طرح انسانوں کا بادشاہ بھی ہے، اِس لیے ضروری ہے کہ عبادت کے ساتھ اُس کی اطاعت بھی کی جائے اور جس معاملے میں کوئی قانون یا ضابطہ اُس نے مقرر کر دیا ہے، اُس کے سامنے انسان ہمیشہ سر تسلیم خم رکھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ معاشرے کو بھی مخاطب کرتا ہے، لیکن اُس وقت جب معاشرے کے افراد اپنے وجود پر یہ حکومت تسلیم کر لیتے ہیں۔ اِس کے لیے نہ ریاست



Marfat.com

کا نام ''اسلامی جمہوریہ'' رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ کسی قرارداد مقاصد کی اور نہ آئینی دفعات کی۔ وہ جب اپنے وجود پر یہ حکومت تسلیم کر لیتے ہیں تو اُن کے معاشرتی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی رویوں میں آپ سے آپ اسلام کا ظہور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا خدا کی شریعت میں کوئی حکم اگر معاشرے سے متعلق ہے تو بغیر کسی تردد کے وہ اُس کے نفاذ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اسلامی حکومت یہی ہے۔ یہ اِس طریقے سے قائم ہوتی ہے تو خدا کی رحمت زمین پر سایہ کرتی ہے۔ لیکن نہ قائم ہو، تب بھی کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے، اِس لیے کہ اسلام کا ہدف یہ حکومت نہیں، بلکہ تزکیۂ نفوس ہے۔ اُس کی دعوت خدا کی اُس بادشاہی کے لیے ہے جو قیامت کے دن اِسی تزکیے کے نتیجے میں حاصل ہوگی۔ وہ لوگوں کو جہنم سے بچنے اور خدا کی اِس ابدی بادشاہی میں داخل ہونے کی دعوت دینے کے لیے آیا ہے، دنیا میں اپنے ماننے والوں کی حکومت قائم کرنے کے لیے نہیں آیا۔ تاہم جو لوگ اِس 'اُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا'* کے لیے بے تاب ہیں، پچھلی ڈیڑھ صدی کے تجربات اُنھوں نے بھی دیکھ لیے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ حقیقت اب اُنھیں بھی تسلیم کر لینی چاہیے کہ اسلامی حکومت نہ شاہی فرمان سے قائم ہوتی ہے، نہ علما کی آمریت سے اور نہ خدائی فوج داروں کی کسی جماعت کے لوگوں پر مسلط ہو جانے سے۔ یہ ہدف نہیں، بلکہ نتیجہ ہے جو اسلام اور اسلامی شریعت پر لوگوں کے شرح صدر سے نکلتا ہے اور اِسی

* الصّف ۶۱: ۱۳۔ ''وہ دوسری چیز جسے تم پسند کرتے ہو۔''



Marfat.com

طرح نکلنا چاہیے۔ یہ اِس طرح نکلے گا تو وہ حکومت قائم ہوگی جسے لفظ کے ہر مفہوم میں اسلامی حکومت کہا جاسکے۔ اِس حکومت کا قیام مقصود ہے تو سیاست بازی میں اپنا وقت ضائع کرنے اور جہاد وقتال کے نام پر خود مرنے اور بے گناہوں کو مارنے کے بجائے پوری قوت دو چیزوں پر صرف کردی جائے:

ایک یہ کہ وعظ وتذکیر سے، علم واستدلال سے، تعلیم وتربیت سے یہ حکومت لوگوں کے دل ودماغ پر قائم کرنے کی کوشش کی جائے، یہاں تک کہ اُن کے ارباب حل وعقد کو بھی اسلام اور اسلامی شریعت کے بارے میں وہی شرح صدر حاصل ہو جائے جو اسلام کی دعوت لے کر اٹھنے والوں کو حاصل ہے۔

دوسرے یہ کہ ہر جگہ جمہوریت اور جمہوری اقدار کو فروغ دیا جائے تاکہ لوگ سیاست ومعیشت میں اسلام کے تقاضے پورے کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو کوئی استبداد اُن کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔ استبدادی قوتوں کے خلاف جدوجہد درحقیقت فتنے کے خلاف جدوجہد ہے اور فتنہ قرآن کے مطابق قتل سے بڑا جرم ہے جس کے مرتکبین، خواہ وہ بادشاہ ہوں یا آمر، اِسی کے مستحق ہیں کہ دنیا کے اسٹیج سے ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیے جائیں۔

[۲۰۱۱ء]



Marfat.com

# اسلام اور ریاست

عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ پاکستان کے بانی اُسے ایک اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ بعد کے زمانوں میں بھی پاکستان کے بارے میں یہی تصور قائم رہا۔ اِس وقت جو لوگ انقلاب اور تبدیلی کے علم بردار بن کر اٹھے ہیں، وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ پاکستان کے عوام سے پوچھا جائے تو اُن کی ایک بڑی اکثریت بھی اِسی تصور کی تصدیق کرتی ہے۔ جمہوری اور فلاحی ریاست کے بہترین نمونے اِس وقت مغربی دنیا میں موجود ہیں، اِس لیے اِن تصورات کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں ہے۔ لیکن 'اسلامی' سے کیا مراد ہے؟ اِس کا ایک نمونہ سعودی عرب کی بادشاہت اور دوسرا ایران کی پاپائیت ہے۔ اسلام کو براہ راست اُس کے ماخذ سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ اِن دونوں کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے نظم اجتماعی سے متعلق اسلام کے مطالبات یہاں بیان کر دیے جائیں تاکہ لوگ اِس روشنی میں اپنے رہنماؤں کے وعدوں اور اقدامات کا جائزہ لے سکیں۔

یہ مطالبات درج ذیل ہیں:

۱۔ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا



Marfat.com

آخری پیغمبر مانتے ہوں، نماز کا اہتمام کرتے ہوں، ریاست کو زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، اُنھیں مسلمان سمجھا جائے گا اور اسلامی شریعت نے جو حقوق خاص اُن کے لیے مقرر کر دیے ہیں، وہ ہر حال میں ادا کیے جائیں گے۔

اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی کی رعایا نہیں، بلکہ برابر کے شہری ہوں گے۔ قانون اور ریاست کی سطح پر اُن کے مابین کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ اُن کے جان و مال اور آبرو کو حرمت حاصل ہوگی، یہاں تک کہ ریاست اُن کی رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس بھی اُن پر عائد نہیں کر سکے گی۔ اُن کے شخصی معاملات، یعنی نکاح، طلاق، تقسیم وراثت، لین دین اور اِس نوعیت کے دوسرے امور میں اگر کوئی نزاع اُن کے درمیان پیدا ہو جائے گی تو اُس کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا۔ روز و شب کی نمازوں، ماہ رمضان کے روزوں اور حج و عمرہ کے لیے اُنھیں تمام ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ نماز اور زکوٰۃ کے سوا اُنھیں قانون کی طاقت سے اسلام کے کسی ایجابی حکم کا پابند نہیں کیا جائے گا۔ اُن پر عدل و انصاف کے ساتھ اور 'اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ' کے طریقے پر حکومت کی جائے گی۔ اُن کے قومی املاک اجتماعی ضرورتوں کے لیے خاص رہیں گے، اُنھیں نجی ملکیت میں نہیں دیا جائے گا، بلکہ اِس طرح نشو و نما دی جائے گی کہ جو لوگ معیشت کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں، اُن کی ضرورتیں بھی اِن املاک کی آمدنی سے پوری ہوتی رہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہوں گے تو اُن کی تجہیز و تکفین مسلمانوں کے طریقے پر ہوگی، اُن کا جنازہ پڑھا جائے گا اور اُنھیں مسلمانوں



Marfat.com

کے قبرستان میں اور اُنھی کے طریقے پر دفن کیا جائے گا۔

۲۔ نماز جمعہ اور نماز عیدین کا اہتمام حکومت کرے گی۔ یہ نمازیں صرف اُنھی مقامات پر ادا کی جائیں گی جو ریاست کی طرف سے اُن کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے۔ اِن کا منبر حکمرانوں کے لیے خاص ہوگا۔ وہ خود اِن نمازوں کا خطبہ دیں گے اور اِن کی امامت کریں گے یا اُن کی طرف سے اُن کا کوئی نمائندہ یہ ذمہ داری ادا کرے گا۔ ریاست کے حدود میں کوئی شخص اپنے طور پر اِن نمازوں کا اہتمام نہیں کر سکے گا۔

۳۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اصلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارے ہوں گے۔ چنانچہ معاشرے کے صالح ترین افراد اِن اداروں کے لیے کارکنوں کی حیثیت سے منتخب کیے جائیں گے۔ وہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کریں گے اور اُن سب چیزوں سے روکیں گے جنھیں انسان ہمیشہ سے برائی سمجھتا رہا ہے۔

۴۔ ریاست اپنے دشمنوں کے معاملے میں بھی قائم بالقسط رہے گی۔ حق کہے گی، حق کی گواہی دے گی اور حق وانصاف سے ہٹ کر کبھی کوئی اقدام نہیں کرے گی۔

۵۔ ریاست کے اندر یا باہر اگر کسی سے کوئی معاہدہ ہوا ہے تو جب تک معاہدہ باقی ہے، لفظ اور معنی، دونوں کے اعتبار سے اُس کی پابندی پوری دیانت اور پورے اخلاص کے ساتھ کی جائے گی۔

۶۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر قتل، چوری، زنا، فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی، خاندانی اور معاشرتی



Marfat.com

حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے تو اُس پر وہ سزائیں نافذ کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد اِن جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔

۷۔ اسلام کی دعوت کو اقصاے عالم تک پہنچانے کے لیے ریاست کی سطح پر اہتمام کیا جائے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اگر اِس میں رکاوٹ پیدا کرے گی یا ایمان لانے والوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنائے گی تو ریاست اپنی استطاعت کے مطابق اِس رکاوٹ کو دور کرنے اور اِس تشدد کو روکنے کی کوشش کرے گی، اگرچہ اِس کے لیے تلوار اٹھانی پڑے*۔

[۲۰۱۲ء]

# نفاذ شریعت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جمہوریت اسلام کے لیے ایک اجنبی تصور ہے۔ حکومت قائم کرنے کا مثالی طریقہ اسلام کی رو سے وہی ہے جو طالبان نے افغانستان میں ملا عمر کی حکومت قائم کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ آئین، پارلیمان اور انتخابات،

* اسلام کے مآخذ میں اِن مطالبات کے دلائل کے لیے دیکھیے، ہماری کتاب: ''میزان''۔



Marfat.com

یہ سب دور جدید کے خرافات ہیں۔ اسلام اپنے نفاذ کے لیے ان میں سے کسی چیز کا پابند نہیں ہے۔ اُس کی جو تعبیر فقہ حنفی میں ہو چکی ہے، ہمارے لیے وہی حتمی ہے۔ فقہا کے اجتہادات بھی مدون ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق فقہا نے اپنے فیصلے مرتب کر دیے ہیں۔ یہ سب قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کی بنیاد پر مرتب کیے گئے ہیں اور فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اِنھیں نافذ ہونا چاہیے۔ اِس کے لیے کسی پارلیمان سے منظوری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کا جو طریقہ یہ حضرات تجویز کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ریاست کے تمام اداروں پر عدلیہ کی بالادستی قائم ہو اور عدلیہ علما کے حوالے کر دی جائے، اِس لیے کہ اسلامی شریعت کے ماہرین وہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گذشتہ بارہ صدیوں کی تاریخ اُن کی پشت پر ہے۔ سلطنت عباسیہ کے قاضی القضاۃ (Chief Justice) کی حیثیت سے امام ابو یوسف کے تقرر کے بعد ہر جگہ یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ اِسے مغربی استعمار نے ختم کیا تھا۔ مسلمان اب آزاد ہیں، لہٰذا نظم ریاست کو شریعت کے مطابق چلانے کا یہ طریقہ بھی بحال ہونا چاہیے۔

اسلام کو جو کچھ میں نے سمجھا ہے، اُس کی بنا پر پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن اِس نقطۂ نظر کو قبول نہیں کرتا۔ نظم ریاست کو چلانے کا جو طریقہ اُس نے بتایا ہے، وہ جمہوریت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' (مسلمانوں کے معاملات اُن کے باہمی مشورے سے چلائے جاتے ہیں)۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اِسی کی وضاحت میں فرمایا ہے: ''جس نے مسلمانوں کی راے کے بغیر کسی کی



Marfat.com

بیعت کی، وہ اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کرے گا۔" ہماری تاریخ میں اِس مقصد سے بادشاہت کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے اور آمریت کا بھی اور ہمارے بعض گروہ اِس بات کے بھی قائل رہے ہیں کہ حکومت کے سربراہ کو خدا کا مامور ہونا چاہیے، لیکن نظم ریاست کو چلانے کے لیے قرآن کا مقرر کردہ قاعدہ یہی ہے۔ اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے یہ قاعدہ جن چیزوں کا تقاضا کرتا ہے، دورِ حاضر کے ایک جلیل القدر عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی تفسیر میں بیان فرمائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں، اُنھیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اِس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ اُن کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں اور اُنھیں اِس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اُس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور اُن کے ہاتھ پاؤں کس کر اور اُن کو بے خبر رکھ کر اُن کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بد دیانتی ہے، جسے کوئی شخص بھی 'اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ' کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو، اُسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور یہ رضامندی اُن کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی یا تحریص واطماع سے خریدی ہوئی یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی، درحقیقت رضامندی نہیں



Marfat.com

ہے۔ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اُس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر یا مال سے خرید کر یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیں اور اِس طرح کے اظہارِ رائے کی اُنھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر یا کسی جتھابندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہوگی، نہ کہ 'اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ' کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہلِ شوریٰ کے اجماع (اتفاقِ رائے) سے دیا جائے یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے'' بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔'' اِس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اِس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات



Marfat.com

طے ہو، اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔'' (تفہیم القرآن ۵۰۹/۴)

اِس سے واضح ہے کہ ریاست سے متعلق دین نے بھی کوئی حکم اگر دیا ہے تو اُس کی تعبیر وتشریح کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ دینی علوم کے ماہرین اپنی اپنی تشریحات پیش کر سکتے ہیں۔ اُن کا حق ہے کہ اپنے موقف کا اظہار کریں، مگر اُن کے اِس موقف کو لوگوں کے لیے واجب الاطاعت قانون کی حیثیت اُسی وقت حاصل ہو گی، جب اُن کے منتخب نمائندوں کی اکثریت اُسے قبول کر لے گی۔ جدید ریاست میں پارلیمان کا ادارہ اِسی مقصد سے قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اُسی کا ہے اور اُسی کا ہونا چاہیے۔ لوگوں کا حق ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں پر تنقید کریں اور اُن کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرتے رہیں، لیکن اُن کی خلاف ورزی اور اُن سے بغاوت کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ علما ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔ ہر ادارہ پابند ہے کہ اُس کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔

پارلیمان کی یہ حیثیت تسلیم کر لی جائے تو ''اسلامی ریاست'' اور ''سیکولر ریاست'' کی تعبیرات بھی غیر متعلق ہو جاتی ہیں۔ اِس طرح کی چیزیں شخصی حکومتوں کے لیے ضروری تھیں۔ ہماری جدوجہد کا محور ایک خالص جمہوری ریاست ہونا چاہیے۔ یہ ریاست اگر ایک مرتبہ قائم ہو جائے تو لوگ جتنے مسلمان ہوں گے، اسلام اُسی کے بقدر اُن کی ریاست کے نظام میں ظہور پذیر ہو جائے گا۔ اِس کا فطری طریقہ یہی



Marfat.com

ہے۔ اِس سے ہٹ کر جو کچھ کیا جائے گا، اُس کا نتیجہ منافقت ہوگی جس کا تجربہ ہم گذشتہ نصف صدی سے پاکستان میں کر رہے ہیں۔

علما اور مصلحین کا اصلی کام یہ ہے کہ تعلیم و تعلم کے ذریعے سے وہ عوام و خواص کے اذہان اِس کے لیے تیار کریں۔ اُنھیں حکمت کے ساتھ اور موعظۂ حسنہ کے اسلوب میں اِس کی دعوت دیں، اُن کے سوالات کا سامنا کریں، اُن کے اشکالات دور کریں اور دلائل کے ساتھ اُنھیں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کیوں دی ہے؟ اجتماعی زندگی کے ساتھ اُس کا کیا تعلق ہے؟ اُس میں احکام کی بنیاد کیا ہے اور دورِ حاضر کا انسان اُس کو سمجھنے میں دقت کیوں محسوس کرتا ہے؟ اُس کی تفہیم و تبیین کے لیے ایسے اسالیب اختیار کریں جن سے اُس کی حکمت، معنویت اور اُس کے مقاصد لوگوں پر واضح ہوں اور اُن کے دل و دماغ پورے اطمینان کے ساتھ اُسے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ قرآن میں اُن کا منصب دعوت و انذار قرار دیا گیا ہے، وہ اپنی قوم کے لیے داروغہ نہیں بنائے گئے کہ اپنے پیروکاروں کے جتھے منظم کر کے بندوق کے زور پر اُسے شریعت کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔ علما تو ایک طرف، ریاست کا نظم اجتماعی بھی نماز اور زکوٰۃ کے سوا دین کے ایجابی تقاضوں میں سے کوئی چیز لوگوں پر قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کر سکتا۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ آخرت میں جواب دہی کے لحاظ سے اسلام کے مطالبات اپنے ماننے والوں سے خواہ کچھ ہوں، اُن کی ریاست جو مطالبات اُن سے کر سکتی ہے، وہ یہی ہیں۔ اِن کے علاوہ یہ صرف



Marfat.com

تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تدریس ہے جس کے ذریعے سے اُن کی اصلاح کی جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ علما اگر سیاست سے دل چسپی رکھتے ہوں تو سیاسی جماعتیں موجود ہیں، وہ اُن میں شامل ہو کر پارلیمان میں پہنچ سکتے اور قانون سازی کے لیے مقرر کردہ طریقوں کے مطابق قانون کی اسلامی تشکیل کے لیے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

[۲۰۰۹ء]

# خدا کے فیصلے

رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اگر اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو کسی خطۂ ارض میں اقتدار حاصل ہو جائے تو خدا کا فیصلہ ہے کہ اُن کے منکرین کے لیے دو ہی صورتیں ہیں: اُن میں اگر مشرکین ہوں گے تو قتل کر دیے جائیں گے اور کسی نہ کسی درجے میں توحید کے ماننے والے ہوں گے تو محکوم بنا لیے جائیں گے۔ بقرہ، انفال اور توبہ میں* اللہ تعالیٰ نے جس قتال کی ہدایت فرمائی اور مشرکین عرب کے جس قتل عام کا حکم دیا ہے، وہ اِسی فیصلے کا نفاذ ہے۔ اِس کا شریعت اور اُس کے احکام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب ''میزان'' میں ہم نے لکھا ہے:

---

* البقرہ۲: ۱۹۰-۱۹۴۔ الانفال۸: ۳۸-۴۰۔ التوبہ۹: ۳-۵، ۲۹۔



Marfat.com

”... یہ محض قتال نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا جو اتمام حجت کے بعد سنت الٰہی کے عین مطابق اور فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اُس کے بعد عرب سے باہر کی قوموں پر نازل کیا گیا۔ لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اِس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے اُنھیں محکوم اور زیر دست بنا کر رکھنے کا حق اِس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اِس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے۔ اِس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی۔“ (۵۹۹)

ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کے بارے میں بھی خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اگر حق پر قائم ہوں اور اُسے بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتے رہیں تو اُن کی دعوت کے منکرین پر اُنھیں غلبہ حاصل ہو گا، لیکن حق سے انحراف کریں تو اُنھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیے جائیں گے۔ یہ وعدہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل، دونوں کے ساتھ ہے۔ قرآن میں صراحت ہے کہ دین کی شہادت کے لیے بنی اسمٰعیل بھی اُسی طرح منتخب کیے گئے، جس طرح اُن سے پہلے بنی اسرائیل منتخب کیے گئے تھے۔* لہٰذا جو وعدے بنی اسرائیل کے

* الحج ۲۲: ۷۸۔



Marfat.com

لیے تورات میں مذکور ہیں اور قرآن نے جگہ جگہ جن کا حوالہ دیا ہے*، وہ اُن کے متعلق بھی آپ سے آپ تسلیم کیے جائیں گے۔ لیکن اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اِس کے لیے خود کوئی اقدام کر سکتے اور دنیا کی قوموں پر اِس مقصد کے لیے حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں، اِس کا حق نہ اُنھیں تورات میں دیا گیا ہے نہ قرآن میں۔ اِس وعدے کا ظہور تکوینی طور پر ہوتا ہے اور اِس کے اسباب بھی اِسی طریقے سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ اُن کا کام صرف یہ ہے کہ خدا کے سب حکموں پر عمل کریں اور اپنی استطاعت کی حد تک شہادت کی وہ ذمہ داری اخلاص اور دیانت داری کے ساتھ پوری کرتے رہیں جس کے لیے خدا نے اُنھیں منتخب فرمایا ہے۔

اِس فیصلے کی ایک فرع یہ ہے کہ فلسطین اور اُس کے گرد و نواح میں کنعان کا علاقہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے اور جزیرہ نماے عرب کا علاقہ بنی اسمٰعیل کے لیے خاص کر دیا ہے تاکہ دنیا کی سب قومیں اُن کے ساتھ اُس کی معیت کا مشاہدہ کریں اور ہدایت پائیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو اِسی بنا پر حکم دیا گیا کہ اپنی میراث کے اِس علاقے کو اُس کے باشندوں سے خالی کرا لیں، اُس میں کسی کافر و مشرک کو زندہ نہ چھوڑیں اور نہ اُس کی سرحدوں سے متصل کسی علاقے میں کافروں اور مشرکوں کی کوئی حکومت قائم رہنے دیں، اِلّا یہ کہ وہ اُن کے باج گزار بن جائیں۔ وہ اِس سے انکار کریں تو سزا کے طور پر اُن کے مرد قتل کر دیے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا

* استثنا ۲۸: ۱-۲۵۔ البقرہ ۲: ۴۰۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۔



Marfat.com

جائے۔ استثنا کے باب ۲۰ میں یہ حکم پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو اِسی کے تحت تسلیم و انقیاد کے لیے مجبور کیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں مشرکین کے تمام معابد اِسی کے تحت ختم کیے گئے۔ 'لا یجتمع دینان فی جزیرة العرب*' کی ہدایت بھی اِسی کے تحت ہے۔ چنانچہ سرزمین عرب میں اِسی بنا پر نہ غیر اللہ کی عبادت کے لیے کوئی معبد تعمیر کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی کافر و مشرک کو رہنے بسنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ تمام احکام توحید کے اِسی مرکز سے متعلق ہیں۔ اِن کا دنیا کے کسی دوسرے علاقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ خدا کے منصوص فیصلے ہیں اور الہامی صحائف میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ تورات میں بھی اِنھیں پوری تفصیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے اور قرآن میں بھی۔ مسلمانوں کی بد قسمتی ہے کہ دور حاضر میں اُن کے بعض جلیل القدر مفکرین اِن فیصلوں کی صحیح نوعیت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ اسلام کی سیاسی تعبیر اِسی غلط فہمی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے، جس کا نتیجہ اِس تعبیر کے زیر اثر اٹھنے والی جہاد و قتال کی تحریکوں کی صورت میں پوری امت مسلمہ بھگت رہی ہے۔ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے اِن فیصلوں کو عالمی سطح پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے تا کہ کسی انتہا پسند کے لیے اِن کی تعمیم کے ذریعے سے کوئی فتنہ پیدا کرنے کی گنجایش نہ رہے۔

[۲۰۱۱ء]

* الموطا، رقم ۲۶۰۷۔ ''جزیرہ نمائے عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔''



Marfat.com

# مذہبی انتہا پسندی

یہ بات اب محتاج دلیل نہیں رہی کہ ریاست پاکستان کے لیے اِس وقت سب سے بڑا مسئلہ مذہبی انتہا پسندی ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ فکر و خیال اور زبان وقلم سے آگے اب یہ قتل و غارت اور دہشت گردی کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ سیاست، معیشت، معاشرت، ہر چیز اِس کی زد میں ہے اور ہزاروں بچے، بوڑھے اور جوان اِس کی نذر ہو چکے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اِس طرح کی صورت حال میں بالآخر لڑنے ہی کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور ہماری ریاست کو بھی غالباً ایک دن یہی کرنا پڑے گا۔ پھر توبہ و استغفار بھی کرنی ہوگی کہ آیندہ ہم مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے کبھی استعمال نہیں کریں گے۔ اِس کی نوبت اگر آ جائے تو انتہا پسندی کو اُس کی جڑ بنیاد سے اکھاڑنے کے لیے یہ چند باتیں مزید پیش نظر رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ انتہا پسندی کا یہ عفریت براہ راست آسمان سے نازل نہیں ہوا۔ یہ اُسی مذہبی فکر کا مولود فساد ہے جو نفاذ شریعت اور جہاد و قتال کے زیر عنوان اور کفر، شرک اور ارتداد کے استیصال کے لیے ہمارے مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے۔ انتہا پسند افراد اور تنظیمیں اُسی سے الہام حاصل کرتی ہیں اور کچھ ترمیمات کے



Marfat.com

بعد اپنے پیش نظر مقاصد کے لیے اُس کو عمل کے سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔ یہ مذہبی فکر قرآن وحدیث کی جن تعبیرات پر مبنی ہے، اُن کی غلطی دور حاضر میں اسلام کے جلیل القدر مفکرین واضح کر چکے ہیں۔ علم واستدلال کے مقابلے میں ہنگامہ واحتجاج اور زور وقوت کے اظہار کا طریقہ ختم ہو جائے تو اِن مفکرین کے رشحات فکر ذہنوں کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ رائج مذہبی فکر کے مقابلے میں یہ گویا ایک جوابی بیانیہ (counter narrative) ہوگا۔ لیکن پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ اُس میں دین وشریعت کی حفاظت کا یہی طریقہ رائج ہے۔ تہذیب اور شایستگی کے ساتھ اختلاف راے کی روایت بدقسمتی سے یہاں قائم نہیں ہو سکی۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ہمارے اہل دانش اور ارباب حل وعقد مذہبی افکار کے آزادانہ اظہار کے لیے بھی اُسی طرح حساس ہوں، جس طرح وہ سیاسی افکار کے معاملے میں حساس ہیں اور اِس آزادانہ اظہار کو روکنے کے لیے جو لوگ دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں، اُنھیں صاف صاف بتا دیں کہ یہ دباؤ ناقابل قبول ہے۔ وہ اگر اپنے ساتھ اختلاف رکھنے والوں کی غلطی واضح کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے لیے بھی واحد راستہ یہی ہے کہ اُسے علم واستدلال سے واضح کرنے کی کوشش کریں۔ علم کی دنیا میں ہنگامہ واحتجاج اور جبر واستبداد کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ پھر یہ اہل دانش اور ارباب حل وعقد خود بھی اُس بیانیہ کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ مسلمانوں کے معاشرے میں سیکولرازم کی تبلیغ نہیں، بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورت حال کی اصلاح کر سکتا ہے۔



Marfat.com

علامہ اقبال نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے زیر عنوان اپنے خطبات میں اِسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی تھی۔

دوسری یہ کہ ہم کسی شخص کو یہ اجازت تو نہیں دیتے کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم کے بغیر ہی وہ بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر یا کسی دوسرے شعبے کا ماہر بنانے کے ادارے قائم کرے۔ مگر دین کا عالم بننے کے لیے اِس طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اِس مقصد کے لیے طلبہ ابتدا ہی سے ایسے مدرسوں میں داخل کر لیے جاتے ہیں، جہاں اُن کے مستقبل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ قدرت نے، ہوسکتا ہے کہ اُنھیں ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان یا شاعر و ادیب اور مصور بننے کے لیے پیدا کیا ہو، مگر یہ مدارس اُن کی اہلیت اور ذوق و رجحان سے قطع نظر اُنھیں عالم بناتے اور شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد زندگی کے کسی دوسرے شعبے کا انتخاب کر لینے کے مواقع اُن کے لیے ختم کر دیتے ہیں۔ پھر جن کو عالم بناتے ہیں، بارہ سال کی عمومی تعلیم سے محرومی کے باعث اُن کی شخصیت کو بھی ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں جس سے وہ اپنے ہی معاشرے میں اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اِس غلطی کے نتائج اب پوری قوم بھگت رہی ہے۔ چنانچہ ناگزیر ہے کہ دینی تعلیم کے اداروں کو بھی اختصاصی تعلیم کے دوسرے اداروں کی طرح پابند کیا جائے کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم کے بغیر وہ کسی طالب علم کو اپنے اداروں میں داخل نہیں کریں گے۔

ہم پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تنہا یہی اقدام اُس صورت حال کو



Marfat.com

تبدیل کر دے گا جو اِس وقت دینی تعلیم کے اداروں نے پیدا کر رکھی ہے۔ لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ عمومی تعلیم کا نظام جو مہارت ہر شعبۂ زندگی میں اختصاصی تعلیم کے لیے فراہم کرتا ہے، وہ دین کا عالم بننے کے لیے بھی فراہم کرے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اِس کے لیے عمومی تعلیم کے چند منتخب اداروں میں بالکل اُسی طرح ایک دینیات گروپ شروع کیا جائے، جس طرح سائنس اور آرٹس کے گروپ اِس وقت موجود ہیں تاکہ جو طلبہ دین کے عالم بننا چاہتے ہوں، وہ اپنی تعلیم کے نویں سال سے اِس گروپ کا انتخاب کریں اور اِس شعبے کی اختصاصی تعلیم کے اداروں میں داخلے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرلیں۔

تیسری یہ کہ انتہا پسندی سے نجات کے لیے اُس ریاست کا خاتمہ ضروری ہے جو علما کو جمعہ کے منبر اور مساجد کے اہتمام سے ہمارے ملک میں حاصل ہو چکی ہے۔ اہل علم اِس حقیقت سے واقف ہیں کہ نماز جمعہ کے بارے میں جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی، وہ یہ تھی کہ اُس کی امامت اور اُس کا خطاب سربراہ حکومت اور اُس کے عمال کریں گے۔ اُن کے سوا کوئی دوسرا شخص اگر اُن کی کسی معذوری کی صورت میں جمعہ کے منبر پر کھڑا ہوگا تو اُن کی اجازت سے اور اُن کے قائم مقام کی حیثیت سے کھڑا ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی یہ سنت پوری شان کے ساتھ قائم رہی، لیکن بعد کے زمانوں میں جب حکمران اپنے اعمال کی وجہ سے اِس کے اہل نہیں رہے



Marfat.com

تو جمعہ کا منبر خود اُنھوں نے علما کے سپرد کر دیا۔ مذہب کے نام پر فتنہ وفساد کو اصلی طاقت اِسی سے حاصل ہوئی۔ یہ صورت حال تبدیل ہونی چاہیے اور ہمارے حکمرانوں کو پورے عزم و جزم کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اِس نماز کا اہتمام اب حکومت کرے گی اور یہ صرف اُنھی مقامات پر ادا کی جائے گی جو ریاست کی طرف سے اِس کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے۔ اِس کا منبر حکمرانوں کے لیے خاص ہوگا۔ وہ خود اِس نماز کا خطبہ دیں گے اور اِس کی امامت کریں گے یا اُن کی طرف سے اُن کا کوئی نمائندہ یہ ذمہ داری ادا کرے گا۔ ریاست کے حدود میں کوئی شخص اپنے طور پر اِس نماز کا اہتمام نہیں کر سکے گا۔

اِسی طرح فیصلہ کرنا چاہیے کہ عام نمازوں کی مسجدیں بھی حکومت کی اجازت سے بنائی جائیں گی۔ وہ کسی خاص فرقے یا مکتب فکر کی مسجدیں نہیں ہوں گی، بلکہ خدا کی مسجدیں ہوں گی، جہاں تنہا اُسی کی عبادت کی جائے گی۔ مسجد مسلمانوں کا ایک اجتماعی ادارہ ہے، اُسے افراد اور تنظیموں کے کنٹرول میں نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی حکومت جہاں بھی قائم ہو، وہ مسجدوں پر اپنا اقتدار پوری قوت کے ساتھ قائم رکھے اور کسی شخص کو اجازت نہ دے کہ وہ اُنھیں کسی تنظیم، تحریک یا کسی خاص نقطۂ نظر کی اشاعت کے لیے استعمال کرے اور اِس طرح خدا کی عبادت گاہوں کے بجاے اُنھیں مسلمانوں کے درمیان تفریق کے مراکز میں تبدیل کر دے۔

یہ اقدام ناگزیر ہے۔ اِس کی برکات اگر کوئی شخص دیکھنا چاہے تو اُن ملکوں میں جا



Marfat.com

کر دیکھ سکتا ہے، جہاں مسجدوں کے انتظام و انصرام کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

[۲۰۱۳ء]

# جہاد و قتال

جہاد کے معنی کسی جدوجہد میں پوری قوت صرف کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ تعبیر جس طرح اللہ کی راہ میں عام جدوجہد کے لیے آئی ہے، اِسی طرح قتال فی سبیل اللہ یا اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے بھی آئی ہے۔ اِس کی دو صورتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں:

ایک کفر کے خلاف جنگ،

دوسرے ظلم و عدوان کے خلاف جنگ۔

پہلی صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اِس دنیا میں ہمیشہ اُس کے براہ راست حکم سے اور اُنھی ہستیوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے۔ اِس قانون کے تحت آپ



Marfat.com

نے اور آپ کے صحابہ نے کفر کے خلاف جو جنگیں لڑی ہیں، وہ محض جنگیں نہ تھیں، بلکہ خدا کا عذاب تھا جو سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اِس کے بعد جزیرہ نمائے عرب سے باہر کی بعض قوموں پر نازل کیا گیا۔ آپ پر نبوت ختم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ لوگوں کے خلاف محض اُن کے کفر کی وجہ سے جنگ اور اِس کے نتیجے میں مفتوحین کو قتل کرنے یا اُن پر جزیہ عائد کر کے اُنھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق بھی آپ اور آپ کے صحابہ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اِس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔

دوسری صورت، البتہ شریعت کا حکم ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے جہاد و قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اسلامی شریعت میں جہاد اِسی مقصد سے کیا جاتا ہے۔ یہ نہ خواہش نفس کے لیے ہے، نہ مال و دولت کے لیے، نہ ملک کی تسخیر اور زمین کی حکومت کے لیے، نہ شہرت و نام وری کے لیے اور نہ حمیت و حمایت اور عصبیت یا عداوت کے کسی جذبے کی تسکین کے لیے۔ انسان کی خود غرضی اور نفسانیت کا اِس جہاد و قتال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی جنگ ہے جو اُس کے بندے، اُس کے حکم پر اور اُس کی ہدایت کے مطابق اُس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اُن کی حیثیت اِس جنگ میں محض آلات و جوارح کی ہے۔ اِس میں



Marfat.com

اُنھیں اپنا کوئی مقصد نہیں، بلکہ خدا کے مقاصد پورے کرنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی اِس حیثیت سے سرمو کوئی انحراف نہیں کر سکتے۔

اِس کا جو قانون قرآن میں بیان ہوا ہے، اُس کی اہم دفعات یہ ہیں:

۱۔ جہاد و قتال کا حکم مسلمانوں کو بحیثیت جماعت دیا گیا ہے۔ اِس کی جو آیتیں بھی قرآن میں آئی ہیں، مسلمان اپنی انفرادی حیثیت میں اُن کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ حدود و تعزیرات کی طرح اِن آیات کے مخاطب وہ بحیثیت جماعت ہیں۔ لہٰذا اِس معاملے میں کسی اقدام کا حق بھی اُن کے نظم اجتماعی کو حاصل ہے۔ اُن کے اندر کا کوئی فرد یا گروہ ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اُن کی طرف سے اِس طرح کے کسی اقدام کا فیصلہ کرے۔

۲۔ قرآن میں اِس کا حکم اصلاً فتنہ کے استیصال کے لیے آیا ہے۔ اِس کے معنی کسی شخص کو ظلم و جبر کے ساتھ اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'persecution' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جان و مال اور عقل و رائے کے خلاف زیادتی کی دوسری تمام صورتیں اِسی کے تحت ہیں۔ چنانچہ ظلم و عدوان جس صورت میں بھی ہو، یہ اُس کے خلاف کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ جہاد مسلمانوں پر اُس وقت تک فرض نہیں ہوتا، جب تک دشمن کے مقابلے میں اُن کی حربی قوت ایک خاص حد تک نہ پہنچ جائے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جہاد و قتال کی اِس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے وہ نہ صرف یہ کہ اپنے اخلاقی وجود کو محکم رکھنے کی کوشش کریں، بلکہ اپنی حربی قوت بھی اُس درجے تک لازماً بڑھائیں جس کا حکم



Marfat.com

قرآن نے زمانۂ رسالت کے مسلمانوں کو اُس وقت کی صورت حال کے لحاظ سے دیا تھا اور اُن کے اور اُن کے دشمنوں کے درمیان اِس کے لیے ایک اور دو کی نسبت قائم کر دی تھی۔

۴۔ جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا صرف اُس صورت میں جرم ہے، جب کوئی مسلمان نفیر عام کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے۔ اُس وقت یہ بے شک، نفاق جیسا بڑا جرم بن جاتا ہے۔ یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ہے جس کے حصول کا جذبہ ہر شخص میں ہونا چاہیے۔ لیکن اِس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے، یہ اُن فرائض میں سے نہیں ہے جنھیں پورا نہ کیا جائے تو آدمی مجرم قرار پائے۔

۵۔ جہاد اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے اِن سے انحراف کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی۔ اِس حکم کے ذیل میں جو سب سے اہم ہدایت قرآن میں بیان ہوئی ہے، وہ عہد کی پابندی کی ہے۔ غدر اور نقض عہد کو اللہ تعالیٰ نے بدترین گناہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ کوئی معاہد قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اُن کی مدد نہیں کی جا سکتی۔ اِسی طرح جو لوگ جنگ کے لیے نہ نکلیں یا جنگ کے موقع پر کسی وجہ سے غیر جانب دار رہنا چاہتے ہوں، اُن کے خلاف بھی کسی اقدام کی اجازت نہیں ہے۔ یہ صرف مقاتلین (combatants) کے خلاف کیا جا سکتا ہے۔

[۲۰۰۹ء]



Marfat.com

# نہی عن المنکر

ایمان کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کی جائے اور برائی سے روکا جائے۔ یہ تلقین کرنا اور روکنا، دونوں حکمت وموعظت کے ساتھ اور دعوت و نصیحت کے اسلوب میں ہونے چاہییں۔ لوگوں کی ہدایت اور گمراہی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ وہ اُن کو بھی جانتا ہے جو اُس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اُن کو بھی جو ہدایت پانے والے ہیں، اِس لیے حق وانصاف کی دعوت کے لیے نہ کسی شخص کو داروغہ بننا چاہیے اور نہ اپنے مخاطبین کے لیے جنت اور جہنم کے فیصلے صادر کرنے چاہییں۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ داعی حق کی حیثیت سے خدا کے کسی پیغمبر کو بھی تذکیر ونصیحت اور بلاغ مبین سے آگے کسی اقدام کی اجازت نہیں دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ، لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ.

''تم نصیحت کرنے والے ہو، تم اِن پر کوئی داروغہ نہیں ہو۔''

(الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲)

دائرۂ اختیار کا معاملہ، البتہ مختلف ہے۔ سن رشد کو پہنچنے کے بعد آدمی کسی عورت کا



Marfat.com

شوہراور اِس کے نتیجے میں بچوں کا باپ بنتا ہے۔ بنی آدم کی یہ دونوں حیثیتیں دین و فطرت کی رو سے اُن کا ایک دائرۂ اختیار پیدا کرتی ہیں۔ یہی صورت اداروں اور حکومتوں کی ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہیں تو اِن کے سربراہوں کے لیے بھی ایک دائرۂ اختیار پیدا ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی دائرے کے اندر ہونے والی برائیوں کے بارے میں فرمایا ہے:

من رأى منكم منكرًا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان. (مسلم، رقم ۱۷۷)

''تم میں سے کوئی شخص برائی دیکھے تو اُسے چاہیے کہ ہاتھ سے اُس کا ازالہ کرے۔ پھر اگر اِس کی ہمت نہ ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اُسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔''

برائی کے لیے اِس روایت میں 'منکر' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد وہ برائیاں نہیں ہیں جو خالص مذہبی احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتی ہیں، بلکہ وہ برائیاں ہیں جنھیں پوری انسانیت بلا امتیاز مذہب وملت برائی سمجھتی ہے۔ چوری، جھوٹ، بددیانتی، غبن، خیانت، ناپ تول میں کمی، ملاوٹ، حق تلفی، فواحش، جان، مال اور آبرو کے خلاف زیادتی اور اِس نوعیت کی دوسری برائیوں کو عربی زبان میں لفظ 'منکر' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اِنھی برائیوں سے متعلق ہے۔ امر بالمعروف اور



Marfat.com

نہی عن المنکر کا جو حکم قرآن میں بیان ہوا ہے، یہ اُسی کی فرع ہے۔ آپ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ اِن برائیوں کو اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں دل سے بھی برا نہیں سمجھو گے تو اِس سے آگے پھر ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

'إن لم يستطع' کے جو الفاظ اِس روایت میں آئے ہیں، اُن کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ اِن سے مراد وہ استطاعت نہیں ہے جو آدمی کو کسی چیز کا مکلّف ٹھیراتی ہے، اِس لیے کہ اُس کے نہ ہونے سے وہ اگر کسی حکم پر عمل نہیں کرتا تو ایمان کے کسی نچلے درجے میں نہیں آجاتا۔ روایت میں یہ الفاظ ہمت اور حوصلے کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں جو ایمان کی قوت اور کمزوری سے کم یا زیادہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ یہ صرف دائرۂ اختیار ہے جس میں کوئی شخص اگر برائی کو ہاتھ سے نہیں روکتا تو اُس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایمان کے پہلے درجے پر نہیں رہا، اِس لیے کہ اختیار و اقتدار کے باوجود اُس نے برائی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اِس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ایمان کے اِس درجے کو پانے کے لیے لوگ اپنے پیرووں کے جتھے منظّم کریں اور ازالۂ منکر کی غرض سے نکل کھڑے ہوں۔ اِس طرح کا اقدام اگر کیا جاتا ہے تو یہ بدترین فساد ہوگا جس کی دین میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ دین کے تمام احکام انسان کے اختیار اور اُس کی استطاعت کے لحاظ سے دیے گئے ہیں۔ 'لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا'* ایک

* البقرہ ۲:۲۸۶۔ ''اللہ (اپنے احکام میں) کسی جان پر اُس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''



Marfat.com

قطعی اصول ہے جو دین و شریعت کے سارے احکام میں ملحوظ ہے۔ نہی عن المنکر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اِسی اصول کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

[۲۰۰۹ء]

# حلال و حرام

زینت کا لفظ عربی زبان میں اُن چیزوں کے لیے آتا ہے جن سے انسان اپنی حس جمالیات کی تسکین کے لیے کسی چیز کو سجاتا بناتا ہے۔ چنانچہ لباس، زیورات وغیرہ بدن کی زینت ہیں؛ پردے، صوفے، قالین، غالیچے، تماثیل، تصویریں اور دوسرا فرنیچر گھروں کی زینت ہے؛ باغات، عمارتیں اور اِس نوعیت کی دوسری چیزیں شہروں کی زینت ہیں، موسیقی آواز کی زینت ہے؛ شاعری کلام کی زینت ہے۔ دین کی صوفیانہ تعبیر اور صوفیانہ مذاہب تو اِن سب چیزوں کو مایا کا جال سمجھتے اور بالعموم حرام یا مکروہ یا قابل ترک اور ارتقاے روحانی میں سدراہ قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے۔ وہ اِن مذاہب کی تردید کرتا اور پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں جائز ہیں، بلکہ نہایت سخت تنبیہ اور تہدید کے انداز میں پوچھتا ہے کہ کون ہے جو زینت کی اِن چیزوں کو حرام قرار دینے کی جسارت کرتا ہے جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں:



Marfat.com

قُلْ، مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ . (الاعراف ۷:۳۲)

''اِن سے کہو، اللہ کی اُس زینت کو کس نے حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور کھانے کی پاک چیزیں کس نے ممنوع ٹھیرادی ہیں۔''

پھر یہی نہیں، وہ اعلان کرتا ہے کہ رزق کے طیبات اور زینت کی یہ سب چیزیں تو اِس دنیا میں پیدا ہی اہل ایمان کے لیے کی گئی ہیں، لہٰذا اصلاً اُنھی کا حق ہیں۔ خدا کے منکروں کو تو یہ اُن کے طفیل اور اُس مہلت کی وجہ سے ملتی ہیں جو دنیا کی آزمایش کے لیے اُنھیں دی گئی ہے۔ چنانچہ آخرت میں یہ تمام تر اہل ایمان کے لیے خاص ہوں گی، منکروں کے لیے اِن میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، وہ اِن سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے جائیں گے:

قُلْ، هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ، كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ . (الاعراف ۷:۳۲)

''یہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتاً اُنھی کے لیے ہوں گی۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں اپنی آیتوں کی اِسی طرح تفصیل کرتے ہیں۔''

قرآن کا یہ اعلان ایک حیرت انگیز اعلان ہے۔ عام مذہبی تصورات اور صوفیانہ



Marfat.com

مذاہب کی تعلیمات کے برخلاف قرآن دینی زندگی کا ایک بالکل ہی دوسرا تصور پیش کرتا ہے۔ تقرب الٰہی اور وصول الی اللہ کے لیے دنیا کی زینتوں سے دست برداری کی تلقین کے بجائے وہ ایمان والوں کو ترغیب دیتا ہے کہ اسراف وتبذیر سے بچ کر اور حدود الٰہی کے اندر وہ زینت کی سب چیزیں بغیر کسی تردد کے استعمال کریں اور خدا کی اِن نعمتوں پر اُس کا شکر بجالائیں:

| | |
|---|---|
| یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ، خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ، وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ، اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ. (الاعراف ۷:۳۱) | ’’آدم کے بیٹو، ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو، مگر اسراف نہ کرو، اِس لیے کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘ |

اِس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی شریعت میں حرام پھر کیا چیزیں ہیں؟ اِس سوال کا جواب قرآن نے سورۂ اعراف میں آگے اِسی مقام پر یہ دیا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اللہ نے صرف پانچ چیزیں حرام قرار دی ہیں: ایک فواحش، دوسرے حق تلفی، تیسرے ناحق زیادتی، چوتھے شرک اور پانچویں بدعت۔

خدا کی شریعت میں یہی پانچ چیزیں حرام ہیں۔ اِن کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ حلال وحرام کے معاملے میں یہ خدا کا اعلان ہے، لہٰذا کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اِن کے علاوہ کسی چیز کو حرام ٹھیرائے۔ چنانچہ اب اگر کوئی چیز حرام ہوگی تو اُسی وقت



Marfat.com

ہوگی، جب اِن میں سے کوئی چیز اُس میں پائی جائے گی۔ روایتیں، آثار، حدیثیں اور پچھلے صحیفوں کے بیانات، سب قرآن کے اِسی ارشاد کی روشنی میں سمجھے جائیں گے۔ اِس سے ہٹ کر یا اِس کے خلاف کوئی چیز بھی قابل قبول نہ ہوگی۔ فرمایا ہے:

قُلْ، اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ، وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا، وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ. (الاعراف ۷:۳۳)

”اِن سے کہہ دو کہ میرے رب نے تو صرف فواحش کو حرام کیا ہے خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اِس کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراؤ جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے اور اِس کو کہ تم اللہ پر افترا کر کے کوئی ایسی بات کہو جسے تم نہیں جانتے۔“

[۲۰۰۹ء]

# سود کا مسئلہ

انسان کسی کو قرض دے اور اُس پر نفع کا مطالبہ کرے تو یہ سود ہے۔ اِس میں اور



Marfat.com

کرایے میں بظاہر کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، لیکن دقت نظر سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ جو چیزیں کرایے پر اٹھائی جاتی ہیں، وہ اُن کے وجود کو برقرار رکھ کر استعمال کی جا سکتی ہیں، مگر روپیہ اِس طریقے سے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے خرچ کر لینے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اُس پر اگر کسی اضافے کا مطالبہ کیا جائے تو یہ فی الواقع ظلم بن جاتا ہے۔ سود اور کرایے میں یہ فرق چونکہ باریک ہے اور انسان اِس کو سمجھنے میں غلطی کر سکتا تھا، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے انسان کو اپنی شریعت دی تو اُسے بتا دیا کہ قرض پر اضافے کا مطالبہ زیادتی ہے، اِسے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سود اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ کی ہر شریعت میں اور ہمیشہ ممنوع رہا ہے۔ قرآن نے بھی پوری صراحت کے ساتھ اِسے ممنوع ٹھیرایا ہے، اِس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بنکاری کا جو نظام اِس زمانے میں رائج ہے، اُس کے بارے میں یہ بحث، البتہ پیدا ہوگئی ہے کہ اِس میں تو بنک جس کاروبار کے لیے قرض دیتا ہے، اُس کی منفعت ہی سے حصہ وصول کرتا ہے۔ لہٰذا سود جس علت کی بنا پر ممنوع قرار دیا گیا ہے، وہ بنکاری کے نظام میں کیا ختم نہیں ہو جاتی؟ یہ استدلال مصر و شام کے بعض علما نے بھی پیش کیا ہے اور ہندوستان کے ایک جلیل القدر عالم اور داعی مولانا وحید الدین خان نے بھی اپنی کتاب ''فکر اسلامی'' میں کسی حد تک اِس کی تصویب فرمائی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ علما کا یہ استدلال معقول ہو سکتا ہے، مگر اِس کے لیے ضروری ہے کہ بنک اپنے نظام میں درج ذیل اصلاحات کر لیں:



Marfat.com

اولاً، جس کاروبار کے لیے روپیہ دیا گیا ہے، اُس میں نقصان ہو جائے یا کاروبار کسی وجہ سے بند کرنا پڑے تو منفعت کا مطالبہ بھی اُسی دن سے بند کر دیا جائے۔ بنک اِس کے بعد صرف اصل زر کا مطالبہ کرے۔

ثانیاً، اشیا قسطوں پر فروخت کی جائیں تو جب تک قسطیں پوری نہ ہوں، بنک اُس شے کی ملکیت میں شریک رہے، ملکیت کے تقاضے پورے کرے اور اُن پر کرایہ لے۔

ثالثاً، روپیہ اگر غیر کاروباری ضرورتوں کے لیے قرض دیا گیا ہے تو افراطِ زر سے جو کمی واقع ہوتی ہے، اُس کی تلافی کے سوا کسی زائد رقم کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

یہ اصلاحات کر لی جائیں تو بنکاری کا نظام بڑی حد تک منصفانہ ہو جاتا ہے۔ تاہم دو سوالات اور بھی ہیں:

ایک یہ کہ جو لوگ سود لیتے نہیں، مگر ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے لیے قرض لیتے اور اُن پر سود دیتے ہیں، اُن کا حکم کیا ہوگا؟

دوسرے یہ کہ حکومتیں بالعموم بچت کی مختلف اسکیمیں بنا کر اپنی ضرورتوں کے لیے لوگوں سے قرض لیتی اور اُس پر کچھ منفعت بھی دیتی ہیں۔ اُس کا کیا حکم ہے؟ کیا اُسے بھی ممنوع قرار دیا جائے گا؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ سود دینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، اِس لیے کہ سود کی حرمت اکل الاموال بالباطل کے اصول پر ہے اور سود دینے والا کسی کا مال باطل



Marfat.com

طریقے پر نہیں کھاتا، بلکہ اپنی جائز کمائی کا ایک حصہ قرض کے معاوضے میں قرض دینے والے کو ادا کرتا ہے۔ سود کا مسئلہ قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر زیر بحث آیا ہے، مگر ہر جگہ دیکھ لیجیے، اُس نے ایک لفظ بھی سود دینے والوں کی مذمت میں نہیں کہا، بلکہ اُنھیں مظلوم قرار دیا اور تنگ دست ہوں تو اصل زر کی واپسی کے لیے مہلت دینے کی تلقین فرمائی ہے۔ جو لوگ اِسے ممنوع قرار دیتے ہیں، اُن کے استدلال کی بنیاد قرآن کی کوئی آیت یا اُس کا اقتضا یا اشارہ نہیں ہے، بلکہ ایک حدیث ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے اور کھلانے والے، دونوں پر لعنت کی ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ... اکل الربٰو وموکلہ*۔ اِس میں کھلانے والے کے لیے لفظ 'موکل' آیا ہے۔ لغت کے اعتبار سے اِس لفظ کا مصداق سود دینے والے بھی ہو سکتے ہیں اور سودی کاروبار کرنے والوں کے ایجنٹ بھی جو اُن کے لیے گاہک ڈھونڈ کر لاتے اور قرض لینے والوں سے مقرر وقت پر سود وصول کر کے اُن تک پہنچاتے ہیں۔ سود پر قرض کے معاملات اگر باقاعدہ کاروبار کی صورت اختیار کر لیں تو اِس طرح کے ایجنٹوں کا وجود ناگزیر ہے۔ اِن کے بغیر سودی کاروبار نہیں چلایا جا سکتا۔ حدیث میں اگر یہی لوگ مراد ہیں تو کوئی اشکال نہیں ہے، اِس لیے کہ یہ صریح تعاون علی الاثم ہے۔ سودی کاروبار کرنے والوں کے کارکنوں کی حیثیت سے جو لوگ اُن کے لیے سودی دستاویزات تیار کرتے اور اُن پر گواہ بنتے ہیں، اُن کا معاملہ

---

* بخاری، رقم ۵۳۴۷۔



Marfat.com

بھی اِسی طرح کا ہے۔ موجودہ بنکاری نظام کا عملہ یہی خدمات انجام دیتا ہے۔ لیکن سودی قرض لینے والوں کو کسی طرح بھی تعاون علی الاثم کا مرتکب قرار نہیں دے سکتے۔ یہ تعبیر اُسی عمل کے لیے موزوں ہو سکتی ہے جو کسی گناہ کے مرتکبین کی طرف سے اور گناہ کے ثمرات میں شرکت کے لیے کیا جائے۔ سودی قرض لینے والے سود خواروں کی معاونت کے لیے نہیں، اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے لیے اُن سے قرض لیتے ہیں۔ یہ اگر تعاون ہے تو اُس سے زیادہ نہیں ہے جو اِس وقت علما اور صلحا بھی اپنی اور اپنے اداروں کی رقوم بنکوں میں جمع کرا کے کر رہے ہیں۔ سود کو ریاست کی سطح پر ممنوع قرار دے کر ہر نوعیت کا سودی کاروبار بند کرا دیا جائے تو یہ، البتہ قانون کی خلاف ورزی کے مجرم ٹھیرائے جا سکتے ہیں۔ حدیث میں اگر اِنھی کا ذکر ہے تو اُس کو پھر اُس موقع سے متعلق ماننا چاہیے، جب سودی کاروبار زمانۂ رسالت میں اِسی طریقے سے بند کرا دیا گیا تھا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ بچت کی مذکورہ اسکیمیں عام سودی معاملات کی طرح نہیں ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن اسکیموں کے ذریعے سے حکومتیں قرض دینے والوں کی شرائط پر نہیں، بلکہ اپنی شرائط پر قرض لیتی ہیں۔ پھر یہی نہیں، اُس کے لیے منفعت کی شرح بھی خود طے کرتی اور اپنی صواب دید سے اُسے کم وبیش بھی کر دیتی ہیں۔ یہ اگرچہ بعینہٖ وہ چیز تو نہیں ہے کہ کسی سے قرض لے کر اُس کی طرف سے کسی مطالبے کے بغیر کچھ اضافے کے ساتھ واپس کر دیا جائے، مگر اُس کے قریب ضرور



Marfat.com

ہے۔ سود کی ممانعت جس زیادتی کو روکنے کے لیے ہوئی ہے، اُس کی شناعت کو معاملے کی یہ صورت بڑی حد تک کم کر دیتی ہے۔ اہل تقویٰ کے لیے تو موزوں یہی ہے کہ اِن سے بھی اجتناب کریں، لیکن عام لوگ، خاص طور پر یتامیٰ، بیوائیں اور ریٹائرڈ ملازمین جو اپنی پونجی کاروباری تجربات کی نذر کرتے ہوئے گھبراتے ہیں، اگر اپنی ناگزیر ضرورتوں کے لیے اِن اسکیموں سے فائدہ اٹھائیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ اِس پر وہ کسی مواخذہ سے دوچار نہیں ہوں گے۔

[۲۰۱۱ء]

## بیمہ

بیمہ یا انشورنس ایک نوعیت کا عقد معاونت ہے جس میں لوگ ایک متعین رقم بالاقساط اِس لیے ادا کرتے ہیں کہ اُن میں سے کسی کے جان و مال کو کوئی نقصان پہنچے تو لوگوں کی جمع شدہ رقوم سے ایک مقررہ قاعدے کے مطابق اُس کے نقصان کا ازالہ کر دیا جائے۔ یہ رقوم کبھی واپس نہیں کی جاتیں، بلکہ جو افراد یا ادارے یہ ذمہ داری اٹھاتے ہیں، اُنھیں اِس عقد معاونت کے شرکا یہ حق بھی دیتے ہیں کہ اپنی اِس خدمت کے معاوضے میں اُن کی جمع شدہ رقوم کو وہ جس طرح چاہیں، استعمال کر سکتے ہیں۔



Marfat.com

یہ ایک غیر معمولی اسکیم ہے جو نقصان کے ازالے اور مشکل حالات میں لوگوں کی معاونت کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ اِس کی افادیت اب ہر جگہ تسلیم کی جاتی ہے۔ قبیلہ، برادری اور عاقلہ کا نظم ختم ہو جانے کے بعد یہ ایک بہترین متبادل ہے جو دورِ حاضر کی معیشت نے دنیا کو فراہم کیا ہے۔ اِس میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی، لیکن علما بالعموم اِسے حرام قرار دیتے ہیں۔ اُن کی طرف سے جو اعتراضات اِس اسکیم پر کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ بیمہ کے ادارے کسی نقصان کی صورت میں جو رقم ادا کرتے ہیں، وہ اداشدہ قسطوں سے بالعموم زیادہ ہوتی ہے۔ یہ سود ہے اور سود اسلامی شریعت میں ممنوع ہے۔ پھر یہ ادارے آگے بھی اپنے اموال سودی کاروبار میں لگاتے ہیں جس کا کچھ نہ کچھ حصہ اُن لوگوں کو بھی پہنچ جاتا ہے جنھیں ازالۂ نقصانات کے لیے رقوم ادا کی جاتی ہیں۔

۲۔ بیمہ کرانے والے بارہا معمولی رقم کے عوض موت یا حوادث یا نقصان کی صورت میں بڑی بڑی رقمیں وصول کر لیتے ہیں۔ یہ جوا ہے اور جوا بھی اسلامی شریعت میں ممنوع ہے۔

۳۔ بیمہ جس چیز کے لیے کیا جاتا ہے، اُس کا وجود متحقق نہیں ہوتا، محلِ عقد بھی غیر واضح ہوتا ہے اور بیمہ کرانے والے یہ بھی نہیں جانتے کہ اُنھیں کب تک اور کتنی اقساط دینا پڑیں گی۔ فقہا کی اصطلاح میں یہ تینوں چیزیں بالترتیب غرر، غبن اور



Marfat.com

جہالت کہلاتی ہیں جن کے ساتھ کوئی معاہدہ جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس طرح کے معاہدات سے منع فرمایا ہے۔

یہ تینوں اعتراضات، اگر غور کیجیے تو بالکل بے بنیاد ہیں۔

پہلا اِس لیے کہ بیمہ میں جو رقوم بالاقساط ادا کی جاتی ہیں، وہ کوئی قرض نہیں ہوتیں۔ اپنی معاونت کے وعدے پر وہ دوسروں کی معاونت کے لیے دی جاتی ہیں، لہٰذا کبھی واپس نہیں لی جاتیں۔ بیمہ کے ادارے اُنھیں سودی کاروبار میں لگاتے ہیں تو اپنے حق استعمال کی بنا پر لگاتے ہیں۔ اِس کی کوئی ذمہ داری بیمہ کرانے والوں پر عائد نہیں ہوتی۔ بیمہ جس معاملے کے لیے کرایا جاتا ہے، وہ پیش آجائے تو جو کچھ ملتا ہے، معاہدے کی رو سے دوسروں کی جمع شدہ رقوم سے ملتا ہے۔ بیمہ کی حقیقت یہی ہے اور اِسے اِسی لحاظ سے دیکھنا چاہیے۔

دوسرا اِس لیے کہ جوا ایک کھیل اور نری قسمت آزمائی ہے۔ اِس میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں، وہ ازالۂ نقصانات کے لیے ایک دوسرے کی معاونت کا کوئی نظم قائم کرنے کے لیے شریک نہیں ہوتے۔ دونوں کی حقیقت الگ ہے اور دین کے احکام ادنیٰ مماثلت پر نہیں، بلکہ اشیا کی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور اِسی پر مبنی ہونے چاہییں۔

تیسرا اِس لیے کہ غرر، غبن اور جہالت سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سدذریعہ کے طور پر اور بیع وشرا میں رفع نزاعات کے لیے ہیں۔ بیمہ بیع وشرا کا کوئی



Marfat.com

معاملہ نہیں ہے۔ یہ باہمی تعاون کی ایک اسکیم ہے جس کا اہتمام کرنے والے افراد اور اداروں کو اُن کی خدمت کے معاوضے میں جمع شدہ رقوم کو استعمال کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔ اِس کی اِس حقیقت کو نظر انداز کر کے اِس پر کوئی حکم لگانا کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

[۲۰۱۰ء]

# یتیم پوتے کی وراثت

پوتے کی میراث میں دادا اور دادا کی میراث میں پوتے کا کوئی حصہ صراحتاً تو قرآن میں بیان نہیں ہوا، لیکن اولاد اور آبا کے الفاظ چونکہ لغت وعرف، دونوں کے اعتبار سے اِن کو بھی شامل ہو جاتے ہیں، اِس لیے فقہا کا ہمیشہ اتفاق رہا ہے کہ بلا واسطہ اولاد اور بلا واسطہ والدین میں سے کوئی موجود نہ ہو تو جو حصہ اُن کے لیے مقرر ہے، وہی بالواسطہ اولاد اور بالواسطہ والدین کو دیا جائے گا۔ تاہم اولاد کے معاملے میں ایک صورت یہ بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک یا چند بچے آدمی کی زندگی میں مر جائیں اور ایک یا چند بچے اُس کے مرنے کے بعد زندہ ہوں۔ فقہا کا اجتہاد یہ ہے کہ اِس صورت



Marfat.com

میں جو بچے مر گئے ہوں، اُن کی اولاد کو دادا کی میراث نہیں پہنچے گی، اپنے چچاؤں کے ہوتے ہوئے وہ اُس سے محروم کر دیے جائیں گے، الّا یہ کہ دادا اُن کے حق میں وصیت کرے۔ دورِ حاضر میں بعض اہلِ علم نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فقہا کا یہ اجتہاد درست معلوم نہیں ہوتا۔ پوتا بمنزلۂ اولاد ہے، اِس لیے بیٹے کی وفات کے بعد اُس کو وہ حصہ ملنا چاہیے جو اُس کا باپ زندہ ہوتا تو اُسے ملتا۔ ہمارے نزدیک یہی رائے صحیح ہے۔ چنانچہ ہم یہاں اُن اعتراضات کا جواب دیں گے جو اِس پر ہمارے ممدوح ومخدوم مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی کتاب ''تفہیمات'' میں کیے ہیں۔ اعتراضات درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآن کی رو سے جس شخص کو بھی میراث کا کوئی حصہ ملتا ہے، خود میت کا اقرب ہونے کی حیثیت سے ملتا ہے، کسی دوسرے اقرب کے قائم مقام کی حیثیت سے نہیں ملتا۔ چنانچہ دادا کی میراث سے یتیم پوتے کو حصہ دینے کی یہ تجویز قائم مقامی کا ایک بالکل غلط نظریہ اسلام کے قانونِ میراث میں داخل کر دیتی ہے جس کا قرآن میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اِس پر مزید یہ کہ قائم مقامی کو بطورِ اصول تسلیم کر لینے کے بعد یہ اُس کو اولاد کی اولاد تک محدود رکھتی ہے۔ اِس کے حق میں بھی کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ قرآن کی رو سے میراث اُنھی لوگوں کا حصہ ہے جو مورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں، مگر یہ تجویز اُن لوگوں کو بھی میراث میں حصہ دار بنا دیتی ہے جو اُس کی



Marfat.com

زندگی میں وفات پا چکے ہوں۔

۳۔قرآن نے بعض رشتہ داروں کے حصے قطعی طور پر بیان کر دیے ہیں، اُن میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، مگر اِس تجویز پر عمل کے نتیجے میں خود قرآن کے مقرر کیے ہوئے بعض حصوں میں کمی اور بعض میں بیشی ہو جاتی ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ پوتے کو یہ حصہ اِس لیے نہیں دیا جا رہا کہ وارث کی حیثیت سے وہ اپنے باپ کا قائم مقام ہے، بلکہ اِس لیے دیا جا رہا ہے کہ باپ کی وفات کے بعد وہ اُسی حیثیت سے دادا کا اقرب ہو گیا ہے، جس حیثیت سے اُس کا باپ اقرب تھا۔ چنانچہ اِس لحاظ سے باپ کا قائم مقام ہے۔ اُس کا باپ زندہ تھا تو اولاد کے رشتے میں اپنے باپ کے لیے وہی اقرب تھا۔ اب وہ دنیا میں نہیں رہا تو اُس کی جگہ پوتا اقرب ہے اور اِسی بنا پر میراث میں حصے کا حق دار ہے۔ باپ کی زندگی میں بھی وہ دادا کے لیے بمنزلۂ اولاد تھا اور اُس کے مرنے کے بعد بھی بمنزلۂ اولاد ہے۔ مرنے کے بعد جو فرق پڑا ہے، وہ یہی ہے کہ دادا کا اقرب ہونے میں بھی باپ کا قائم مقام ہو گیا ہے۔ یہ اُس معنی میں قائم مقامی نہیں ہے، جس معنی میں مولانا اِسے سمجھ رہے ہیں۔ یہ میت کا اقرب ہونے میں قائم مقامی ہے جو خود مولانا کے بیان کے مطابق اسلامی قانون میراث کی بنیاد ہے۔ میت کی اولاد میں نیچے تک کوئی نہ ہو تو بہن بھائی اِسی حیثیت سے اولاد کے قائم مقام ہو جاتے ہیں اور قرآن کی رو سے اُسی طریقے کے مطابق اور ٹھیک وہی حصہ پاتے ہیں جو اولاد کی موجودگی میں اُس کے لیے



Marfat.com

مقرر ہے۔ اِس قائم مقامی کے لیے سورۂ نساء (۴) کی آخری آیت نص قطعی ہے۔ اِسے اولاد کی اولاد تک محدود رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بیوی یا شوہر کے مرجانے کے بعد اُن کا کوئی وارث کسی بھی درجے میں بیوی یا شوہر نہیں ہوجاتا کہ اُسے میت کا اقرب ہونے میں اُن کا قائم مقام قرار دیا جائے۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ پوتے کو جو حصہ دیا جار ہا ہے، وہ باپ کا حصہ نہیں ہے جو وارث کی حیثیت سے اُس کے بیٹے کو دیا جار ہا ہے، بلکہ خود اُسی کا حصہ ہے جو اِس لیے دیا جار ہا ہے کہ باپ کی وفات کے بعد وہ اُس کی جگہ پر اور اُسی حیثیت سے دادا کا اقرب ہو گیا ہے۔ اِس سے قرآن کے اِس اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ میراث اُنھی لوگوں کا حصہ ہے جو مورث کی وفات کے وقت زندہ ہوں۔ یتیم پوتے کو میراث میں حصہ دینے کی یہ تجویز بھی اُسی کو حصہ دار بنا رہی ہے جو مورث کی وفات کے وقت زندہ ہے۔

تیسرا اعتراض اِس غلط فہمی سے پیدا ہوا ہے کہ پوتوں میں تقسیم وراثت کا یہی طریقہ اُس وقت بھی اختیار کیا جائے گا، جب اولاد میں سے کوئی موجود نہ ہو۔ مولانا نے ایک مثال سے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...فرض کیجیے کہ ایک شخص کے دو ہی لڑکے تھے اور دونوں اُس کی زندگی میں وفات پا گئے۔ ایک لڑکا اپنے پیچھے چار بچے چھوڑ کر مرا۔ دوسرا لڑکا صرف ایک بچہ چھوڑ کر مرا۔ قرآن کی رو سے یہ پانچوں پوتے حق ولایت میں بالکل برابر ہیں،



Marfat.com

اِس لیے دادا کے ترکے میں سے اُن سب کو برابر حصہ ملنا چاہیے، مگر قائم مقامی کے اصول پر اُس کی جائداد میں سے آٹھ آنے ایک پوتے کو ملیں گے اور باقی چار پوتوں کے حصے میں صرف دو دو آنے آئیں گے۔''

(تفہیمات، ابوالاعلیٰ مودودی ۱۸۲/۳)

اِس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے۔ اِس صورت میں وہی طریقہ قائم رکھا جا سکتا ہے کہ جو اِس وقت اختیار کیا جاتا ہے، یعنی سب پوتوں کو برابر حصہ دیا جائے۔ اِس کی رہنمائی خود قرآن کے اندر موجود ہے۔ اُس نے ایک وارث کو دوسرے وارثوں کی موجودگی میں ایک طریقے سے اور عدم موجودگی میں دوسرے طریقے سے حصہ دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ اولاد موجود ہو تو والدین میں سے ہر ایک کا حصہ ۱/۶ ہے۔ اولاد موجود نہ ہو اور بھائی بہن ہوں تو اُن کا حصہ یہی رہے گا۔ لیکن میت کے وارث صرف والدین ہوں تو ماں کا حصہ ایک تہائی اور باپ کا دو تہائی ہے۔ یہی صورت کلالہ رشتہ داروں کی ہے۔ اُن میں سے کسی کو وارث بنا دیا جائے اور اُس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اُن میں سے ہر ایک کا حصہ ۱/۶ ہے، لیکن بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے اور اُنھیں برابر حصہ ملے گا۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ پوتوں کے لیے دونوں صورتوں میں ایک ہی طریقے پر اصرار کیا جائے۔ یہ سراسر ایک اجتہادی معاملہ ہے۔ اِس میں جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے، اُسے قرآن کے مقرر کردہ اصول وضوابط کے مطابق اور ہر حال میں قرین انصاف



Marfat.com

ہونا چاہیے۔

[۲۰۱۱ء]

# وصیت کا حق

تقسیم وراثت کا جو قانون قرآن میں بیان ہوا ہے، اُس میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ یہ تقسیم اُس وصیت کے بعد ہے جو مرنے والا کسی کے لیے کرتا ہے۔ اِس پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ وصیت کے لیے کوئی حد مقرر کی گئی ہے یا آدمی جس کے لیے جتنی چاہے وصیت کر سکتا ہے؟

دوسرا یہ کہ وصیت کیا اُن لوگوں کے حق میں بھی ہو سکتی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے میت کا وارث ٹھیرایا ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں کسی تحدید کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق فرمایا ہے کہ یہ تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی۔ زبان و بیان کے کسی قاعدے کی رو سے اِس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے جو روایت اِس



Marfat.com

معاملے میں نقل ہوئی ہے، اُس کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ آپ کے ایک صحابی نے آپ کے سامنے اپنی اِس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں دینا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ زیادہ ہے، آدمی کے پاس مال ہو تو اُسے اپنے وارثوں کو محتاج چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ اُنھوں نے دو تہائی اور پھر آدھا مال دینے کے لیے پوچھا۔ اِس پر بھی آپ نے وہی بات فرمائی۔ اُنھوں نے پوچھا کہ ایک تہائی دے دوں۔ آپ نے فرمایا: یہی بہت ہے*۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خاص صورت حال میں ایک خاص شخص کے فیصلے پر آپ کا تبصرہ ہے۔ اِس کا کسی قانونی تحدید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وارثوں کے حق میں خود اللہ تعالیٰ نے وصیت کر دی ہے۔ اللہ کی وصیت کے مقابلے میں کوئی مسلمان اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ اُن کے لیے کوئی وصیت بر بنائے رشتہ داری نہیں ہو سکتی، مگر اِنھی وارثوں کی کوئی ضرورت یا اِن میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اِسی نوعیت کی کوئی دوسری چیز تقاضا کرے تو وصیت یقیناً ہو سکتی ہے۔ چنانچہ کسی کا کوئی بچہ اگر زیر تعلیم ہے، دوسرے بچے برسر روزگار ہیں اور وہ ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکا یا بچوں میں سے کسی نے والدین کی زیادہ خدمت کی ہے یا کسی کو اپنی بیوی کے معاملے میں اندیشہ ہے کہ اُس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد

---

* بخاری، رقم ۲۷۴۲۔ مسلم، رقم ۱۶۲۸۔



Marfat.com

اُس کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا تو وہ اِن کے حق میں وصیت کر سکتا ہے۔ یہ وصیت جس طرح دوست احباب کے لیے ہو سکتی ہے، صدقہ و خیرات کی غرض سے ہو سکتی ہے، اِسی طرح اِن وارثوں کے حق میں بھی ہو سکتی ہے۔ اِس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

[۲۰۰۸ء]

# تقسیم وراثت

تقسیم وراثت کا قانون قرآن مجید کی سورۂ نساء (۴) میں بیان ہوا ہے۔ یہ قانون جہاں مذکور ہے، وہیں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو ہمیشہ کے عذاب کی وعید سنائی ہے جو اِس قانون کو تبدیل کریں یا جانتے بوجھتے اِس کی خلاف ورزی کی جسارت کریں۔ یہ وعید اگرچہ اُن سب حدود الٰہی کے بارے میں ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں، لیکن تقسیم وراثت کا ضابطہ بیان کرنے کے فوراً بعد اِس کا ذکر بتاتا ہے کہ خاص اِس ضابطے کی خلاف ورزی لوگوں کے لیے کس قدر سنگین نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ، وَ مَنْ يُّطِعِ | ''یہ اللہ کی ٹھیرائی ہوئی حدیں ہیں، |
| اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ | (اِن سے آگے نہ بڑھو) اور (یاد رکھو |



Marfat.com

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ، خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا، وَذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ. وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ، یُدۡخِلۡهُ نَارًا، خَالِدًا فِیۡهَا، وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیۡنٌ.
(النساء۴:۱۳-۱۴)

کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کریں گے، اُنھیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اُس کی ٹھیرائی ہوئی حدوں سے آگے بڑھیں گے، اُنھیں ایسی آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کے لیے رسوا کر دینے والی سزا ہے۔''

یہ وعید اِس قدر سخت ہے کہ آدمی آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اِس کو پڑھ کر کانپ جاتا ہے، لیکن انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے اِس قانون کو بدلتے بھی ہیں اور عملاً اِس کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اِس معاملے میں جو نافرمانیاں ہوتی ہیں، وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ عورتوں کو میراث سے محروم کرتے ہیں۔ یہ قانون اگر کسی جگہ ریاست کی سطح پر نافذ ہے تو عدالتوں کی گرفت سے بچنے کے لیے بالکل



Marfat.com

ناجائز طریقوں سے دباؤ ڈال کر اُن سے دست برداری کی دستاویزات لکھواتے ہیں۔عورتوں اور مردوں کا حصہ جہاں برابر نہیں ہے، اُسے برابر کر دینے کی جسارت کرتے ہیں۔صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھیراتے ہیں۔ دیہات میں بالخصوص مشترک خاندانی جائداد کا طریقہ اختیار کر لینے پر اصرار کرتے ہیں۔یتیموں کا حصہ کھا جانے کی تدبیریں کرتے ہیں۔غرض یہ کہ ہر وہ کام کرتے ہیں جسے خدا کے قانون سے کھلی بغاوت ہی کہا جا سکتا ہے۔

یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ اُنھیں مسجدوں سے متنبہ کیا جائے، منبروں سے پکارا جائے، ریڈیو، ٹیلیویژن اور اخبارات کے ذریعے سے بار بار توجہ دلائی جائے، تعلیم و تربیت کے اداروں میں درس دیا جائے کہ دنیا کی زندگی اور اُس کا مال و منال ایک متاع غرور ہے۔روز قیامت خدا کی بادشاہی میں حصہ پانے کے بجائے یہ تم کس چیز کا انتخاب کر رہے ہو۔قرآن کے الفاظ میں گویا اپنے پیٹ میں انگارے بھر رہے ہو۔اُنھیں بتایا جائے کہ ہمیشہ کی دوزخ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔اُس سے بچو اور اپنی میراث پوری دیانت داری کے ساتھ ٹھیک اُس قانون کے مطابق تقسیم کرو جو اللہ نے اِس باب میں مقرر کر دیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی شخص نے بالشت برابر زمین پر بھی ناجائز قبضہ کیا تو قیامت میں اُس کو طوق بنا کر اُس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا*۔

* بخاری، رقم ۳۱۹۸۔ مسلم، رقم ۴۱۳۳۔



Marfat.com

تقسیم وراثت کا یہ قانون کیا ہے؟ اِس کی تفصیلات ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دی ہیں۔ یہاں محض یاد دہانی کے لیے اُس کا خلاصہ چند نکات کی صورت میں بیان کیے دیتے ہیں۔

۱۔ مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اُس کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا۔ پھر کوئی وصیت اگر اُس نے کی ہو تو وہ پوری کی جائے گی۔ اِس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔

۲۔ وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی، الاّ یہ کہ اُس کے حالات یا اُس کی کوئی خدمت یا ضرورت کسی خاص صورت حال میں اِس کا تقاضا کرے۔

۳۔ والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد ترکے کی وارث میت کی اولاد ہے۔ مرنے والے نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اُس کی اولاد میں دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہی ہوں تو اُنھیں بچے ہوئے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا۔ ایک ہی لڑکی ہو تو وہ اُس کے نصف کی حق دار ہوگی۔ میت کی اولاد میں صرف لڑکے ہی ہوں تو یہ سارا مال اُن میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اولاد میں لڑکے لڑکیاں، دونوں ہوں تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا اور اِس صورت میں بھی سارا مال اُنھی میں تقسیم کیا جائے گا۔

۴۔ اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے بھائی بہن اولاد کے قائم مقام ہیں۔



Marfat.com

والدین اور بیوی یا شوہر موجود ہوں تو اُن کا حصہ دینے کے بعد میت کے وارث یہی ہوں گے۔ ذکور واناث کے لیے اُن کے حصے اور اُن میں تقسیم وراثت کا طریقہ وہی ہے جو اولاد کے لیے اوپر بیان ہوا ہے۔

۵۔ میت کے اولاد ہو یا اولاد نہ ہو اور بھائی بہن ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ بھائی بہن بھی نہ ہوں اور تنہا والدین ہی میت کے وارث ہوں تو ترکے کا ایک تہائی ماں اور دو تہائی باپ کا حق ہے۔

۶۔ مرنے والا مرد ہو اور اُس کی اولاد ہو تو اُس کی بیوی کو ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ اُس کے اولاد نہ ہو تو وہ ایک چوتھائی ترکے کی حق دار ہوگی۔ میت عورت ہو اور اُس کی اولاد نہ ہو تو نصف ترکہ اُس کے شوہر کا ہے اور اگر اُس کے اولاد ہو تو شوہر کو چوتھائی ترکہ ملے گا۔

۷۔ اِن وارثوں کی عدم موجودگی میں مرنے والا اگر چاہے تو کسی کو ترکے کا وارث بنا سکتا ہے۔ جس شخص کو وارث بنایا گیا ہو، وہ اگر رشتہ دار ہو اور اُس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو چھٹا حصہ اور ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو ایک تہائی اُنھیں دینے کے بعد باقی ۵/۶ یا دو تہائی اُسے ملے گا۔

[۲۰۱۰ء]



Marfat.com

# رویت ہلال کا مسئلہ

اللہ تعالیٰ نے روزوں کے لیے رمضان اور حج کے لیے ذوالحجہ کا مہینا مقرر فرمایا ہے۔ یہ دونوں قمری مہینے ہیں، اِس لیے یہ سوال ابتدا ہی سے زیر بحث رہا ہے کہ اِن کی تعیین کس طرح کی جائے؟ علم فلکیات نے جو ترقی اِس زمانے میں کی ہے، اُس سے پہلے بھی لوگ اِس بات سے تو واقف تھے کہ قمری مہینے تیس دن سے زیادہ کے نہیں ہو سکتے، مگر عام مشاہدہ بتاتا تھا کہ یہ انتیس دن کے بھی ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے جب لوگوں کو پورے مہینے کے روزے رکھنے کا حکم دیا تو اندیشہ ہوا کہ اُن میں سے کچھ لوگ اس حکم کی تعمیل میں تیس دن پورے کرنے پر اصرار کریں گے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا کہ چاند نظر آ جائے تو رمضان کا مہینا شروع کر لینا چاہیے اور نظر آ جائے تو اُس کو ختم کر دینا چاہیے۔ اِس کے لیے تیس دن پورے کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں، مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن لازماً پورے کیے جائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد ہے جسے راویوں نے اپنے تصرفات سے وہ صورت دے دی جس سے یہ تاثر عام ہو گیا کہ آپ نے مہینے کی تعیین کے لیے لوگوں کو چاند دیکھنے کا پابند کر دیا



Marfat.com

ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ روایت کے ایک طریقے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت اپنی اصل صورت میں بھی نقل ہوگئی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| الشهر تسع وعشرون، فإذا رأيتم الهلال فصوموا ، وإذا رأيتموه فأفطروا ، فإن غم عليكم فاقدروا له. | ''مہینا انتیس دن کا بھی ہوتا ہے، اِس لیے چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور دیکھ لو تو افطار کرو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو دن پورے کر لو۔'' |

(مسلم، رقم ۱۰۸۰)

یہ سیدنا عبداللہ بن عمر کی روایت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ایک طریق میں بھی بعینہٖ یہی الفاظ ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ مہینے کی تعیین کے لیے چاند دیکھنے کو لازم نہیں کیا گیا، بلکہ چاند دیکھ لینے کے بعد مہینا شروع کر لینے کو لازم ٹھیرایا گیا ہے تاکہ لوگ یہ خیال کر کے کہ قرآن نے پورے مہینے کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے، تیس دن پورے کرنے پر اصرار نہ کریں۔ چنانچہ بات کی ابتدا ہی یہاں سے ہوتی ہے کہ 'الشهر تسع وعشرون' (مہینا انتیس دن کا بھی ہوتا ہے)۔

چاند دیکھنے کی ضرورت اِسی بنا پر ہے۔ تیس دن پورے ہو جائیں تو یہ ضرورت باقی نہیں رہتی، اِس لیے کہ اِس معاملے میں ہمارا علم بالکل قطعی ہے۔ چاند نظر آئے یا نہ آئے، ہم جانتے ہیں کہ پچھلا مہینا ختم ہوا اور اگلا مہینا شروع ہو چکا ہے۔ علم کی ترقی نے یہی صورت انتیس کے بارے میں بھی پیدا کر دی ہے۔ اب ہم پوری قطعیت کے



Marfat.com

ساتھ بتا سکتے ہیں کہ دنیا کے لیے چاند کی پیدایش کب ہوگی۔ اِس لیے مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر اگر چاند کی پیدایش کے لحاظ سے قمری کیلنڈر بنا دیا جائے اور تمام مذہبی تہوار اُسی کے مطابق منائے جائیں تو اِس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ دین کا منشا مہینے کی تعیین ہے۔ وہ اگر چاند دیکھنے سے ہو سکتی تھی تو اُس نے اُسے اختیار کیا اور اب اگر کسی دوسرے ذریعے سے ہو سکتی ہے تو اِس پر بھی اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ گھڑی ایجاد ہو جانے کے بعد ہم اپنی نمازوں کے لیے جس طرح سورج کا طلوع و غروب دیکھنے کے پابند نہیں رہے، اِسی طرح قمری مہینوں کی تعیین کے لیے رویت ہلال کے پابند بھی نہیں رہے۔ یہ مسئلہ محض ایک حدیث میں راویوں کے تصرفات سے پیدا ہوا ہے۔ روایت کے تمام طریقوں کو دیکھنے سے یہ حقیقت بادنیٰ تامل واضح ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا بالکل دوسرا تھا۔

[۲۰۰۸ء]

# اعضا کی پیوند کاری

پچھلی دو صدیوں میں سائنس نے جو کرشمے دکھائے اور انسانیت کے لیے جو



Marfat.com

سہولتیں پیدا کی ہیں، اُن میں سے ایک غیر معمولی چیز یہ ہے کہ سرجری کے ذریعے سے انسان کے ناقص اعضا کسی دوسرے شخص کے تندرست اعضا سے تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ معاملہ زندگی میں بھی ہو سکتا ہے اور موت کے بعد بھی۔ اِس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ دین وشریعت کی رو سے کیا یہ جائز ہے کہ کوئی شخص زندگی میں اپنا کوئی عضو کسی کو ہبہ کر دے یا وصیت کرے کہ مرنے کے بعد یہ عضو دوسرے شخص کو دیا جا سکتا ہے؟

اِس سوال کا جواب اثبات میں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ قرآن وحدیث میں بظاہر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اِس میں مانع ہو، مگر برصغیر کے علما بالعموم اِسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اِس معاملے میں دو باتیں کہی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے، لہٰذا اُس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے پہلے اپنے اعضا کسی کو دینے کی وصیت کرے۔ آدمی کا جسم اُسی وقت تک اُس کے تصرف میں ہے، جب تک وہ خود اُس جسم میں رہتا ہے، اُس سے نکل جانے کے بعد اُس کا اِس جسم پر کوئی حق باقی نہیں رہتا کہ وہ اُس کے بارے میں وصیت کرے اور اُس کی یہ وصیت نافذ العمل قرار دی جائے۔

دوسری یہ کہ انسانی لاش کی حرمت قائم رہنی چاہیے۔ زندہ انسان اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اُن کا فرض ہے کہ مرنے والے کا جسم پورے احترام کے ساتھ دفن کر دیں۔ لاش کو چیرنا پھاڑنا یا اُس کا کوئی عضو کاٹ لینا اُس کی بے حرمتی ہے اور دنیا کا کوئی اخلاقی نظام اِس کی اجازت نہیں دے سکتا۔



Marfat.com

ہمارے نزدیک یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں۔

اِس میں شبہ نہیں کہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے، مگر اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں انسان کو دی ہیں، حدودالٰہی کے اندر وہ اُن میں ہر طرح کے تصرف کا حق رکھتا ہے۔ چنانچہ عزت، آبرو، اہل وعیال اور اپنے وطن اور دین کے لیے وہ اپنی جان قربان کر دیتا ہے، اپنا مال لٹا دیتا ہے، اور یہ جانتے ہوئے کہ مارا جاؤں گا یا اپنا کوئی عضو کھو دوں گا، اِنھی مقاصد کے لیے اپنے آپ کو جنگ میں جھونک دیتا ہے، آگ میں کود پڑتا ہے، بڑے سے بڑے خطرے کو انگیز کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اِن تصرفات کو نفس اور مال کے جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا ہے اور اپنے ماننے والوں کو جگہ جگہ ترغیب دی ہے کہ اپنی یہ چیزیں وہ اِن مقاصد کے لیے خرچ کریں۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآن اِس حق تصرف کو تسلیم کرتا ہے۔

انسان کا حق وصیت اِسی حق تصرف کا لازمہ ہے۔ چنانچہ ہم جس طرح یہ حق رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اپنے مال کے بارے میں وصیت کریں، اِسی طرح یہ حق بھی رکھتے ہیں کہ اپنے جسم کی تجہیز و تکفین اور تدفین کے بارے میں وصیت کر دیں۔ اپنا کوئی عضو کسی شخص کو دینے کی وصیت بھی اِسی قبیل سے ہے۔ پہلی سب چیزیں اگر جائز ہیں اور آدمی کے اپنے جسم سے نکل جانے کے باوجود ہو سکتی ہیں تو اعضا کے بارے میں وصیت کو ناجائز کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟



Marfat.com

لاش کی بے حرمتی کو بھی اِسی طرح دیکھنا چاہیے۔ اِس کا تعلق نیت اور محرکات سے ہے۔ کسی شخص کے عضو کو نقصان پہنچانا جرم ہے۔ قرآن میں اِس کے لیے قصاص اور دیت کے احکام دیے گئے ہیں، لیکن مریض کی اجازت سے ایک ڈاکٹر اُس کا ہاتھ یا پاؤں کاٹ دیتا ہے تو کوئی شخص بھی اُسے مجرم قرار نہیں دیتا۔ پھر مقتول کی لاش پر گھوڑے دوڑانے یا اُس کا مثلہ کرنے اور تحقیق و تفتیش کے لیے اُس کا پوسٹمارٹم کرنے میں فرق کیوں نہ کیا جائے؟ آدمی اپنا مال کسی ضرورت مند کو دینے کی وصیت کرے تو یہ ایک نیکی کا کام ہے، اِسی طرح اپنا کوئی عضو کسی ضرورت مند کو دینے کی وصیت کرے تو اِسے بھی نیکی ہی کہنا چاہیے۔ اِس کی تعمیل کو لاش کی بے حرمتی کیوں سمجھا جائے؟

[۲۰۱۰ء]

# ڈاڑھی اور اسبال ازار

ڈاڑھی مرد رکھتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ آپ کے ماننے والوں میں سے کوئی شخص اگر آپ کے ساتھ تعلق خاطر کے اظہار کے لیے یا آپ کی اتباع کے شوق میں ڈاڑھی رکھتا ہے تو اِسے باعث سعادت سمجھنا



Marfat.com

چاہیے، لیکن یہ دین کا کوئی حکم نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر ڈاڑھی نہیں رکھتا تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی فرض و واجب کا تارک ہے یا اُس نے کسی حرام یا ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس معاملے میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ ڈاڑھی رکھنے کی ہدایت نہیں ہے، بلکہ اِس بات کی ممانعت ہے کہ ڈاڑھی اور مونچھیں رکھنے کی کوئی ایسی وضع اختیار نہیں کرنی چاہیے جو متکبرانہ ہو۔ تکبر ایک بڑا جرم ہے۔ یہ انسان کی چال ڈھال، گفتگو، وضع قطع، لباس اور نشست و برخاست، ہر چیز میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہی معاملہ ڈاڑھی اور مونچھوں کا بھی ہے۔ بعض لوگ ڈاڑھی مونڈ ھتے ہیں یا چھوٹی رکھتے ہیں، لیکن مونچھیں بہت بڑھا لیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسے پسند نہیں کیا اور اِس طرح کے لوگوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ متکبرین کی وضع اختیار نہ کریں۔ وہ اگر بڑھانا چاہتے ہیں تو ڈاڑھی بڑھا لیں، مگر مونچھیں ہر حال میں چھوٹی رکھیں*۔ انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے جو ہدایت انسان کو ملی ہے، اُس کا موضوع عبادات ہیں، تطہیر بدن ہے، تطہیر خور ونوش اور تطہیر اخلاق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، تطہیر اخلاق کے مقصد سے فرمایا ہے۔ ڈاڑھی سے متعلق آپ کی نصیحت کا صحیح محل یہی تھا، مگر لوگوں نے اِسے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم سمجھا اور اِس طرح ایک ایسی چیز دین میں داخل کر دی جو اِس سے کسی طرح متعلق نہیں ہو سکتی۔

یہی معاملہ ٹخنوں سے نیچے ازار کا ہے۔ عرب جاہلی میں متکبرین کا عام طریقہ تھا کہ

* بخاری، رقم ۵۸۹۲۔ مسلم، رقم ۶۰۲۔



Marfat.com

لمبا قمیص پہنیں گے، پگڑی کا شملہ کمر سے نیچے تک لٹکتا ہوا ہوگا، ازار ٹخنوں سے اِس قدر نیچے ہوگی کہ گویا آدھی زمین پر گھسٹ رہی ہے۔ عربی زبان میں اِسے اسبال کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کو سخت ناپسند کیا اور فرمایا ہے کہ اللہ قیامت کے دن اُس شخص کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا جو غرور سے اپنا تہ بند گھسیٹتے ہوئے چلتا ہو*۔ ازار کے بارے میں تمام روایات اِسی وضع سے متعلق ہیں۔

تہ بند کے بارے میں یہ بات، البتہ کہی جا سکتی ہے کہ اُسے ٹخنوں سے نیچے لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جائے تو متکبرین کی اِس وضع سے ایک نوعیت کی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے، اِس لیے لٹکانے کی وجہ تکبر نہ بھی ہو تو احتیاط کرنی چاہیے۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے، لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ مشابہت تہ بند ہی میں ہوتی ہے، ہماری شلوار، پاجامے اور پتلون سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۲۰۰۸ء]

# عورت کی تادیب

نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں مرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بیوی بچوں

---

* بخاری، رقم ۵۷۸۳۔ مسلم، رقم ۵۴۵۵۔



Marfat.com

کے اخراجات فراخ دلی کے ساتھ پورے کرے اور اُن کے ساتھ اِس طرح کا برتاؤ کرے جو شریفوں کے شایانِ شان ہو، عقل وفطرت کے مطابق ہو، رحم ومروت پر مبنی ہو اور اُس میں عدل وانصاف کے تقاضے ملحوظ رہے ہوں۔ اِسی طرح عورت سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ اُسے شوہر کے ساتھ موافقت اور فرماں برداری کا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور شوہر کے رازوں اور اُس کی عزت وناموس کی حفاظت کرنی چاہیے۔

تمام دوسرے معاہدات کی طرح معاہدے کی یہ نوعیت بھی تقاضا کرتی ہے کہ فریقین میں سے اگر کوئی اِس کی خلاف ورزی کرے اور تنبیہ، تلقین اور زجروتوبیخ کے باوجود اپنی اصلاح کے لیے تیار نہ ہو تو اُس کی تادیب کی جائے۔ یہ تادیب عدالت بھی کرسکتی ہے اور خاندان کے بڑے اور بزرگ بھی کرسکتے ہیں۔ قرآن نے یہ حق شوہر کو بھی دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ عورت اگر اُس کی قوامیت کو چیلنج کرکے سرکشی پر اتر آئے تو اپنا گھر بچانے کے لیے وہ تین صورتیں اختیار کرسکتا ہے:

پہلی یہ کہ عورت کو نصیحت کی جائے۔ قرآن میں اِس کے لیے 'وَعْظ' کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اِس میں کسی حد تک زجروتوبیخ بھی ہوسکتی ہے۔

دوسری یہ کہ اُس سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کردیا جائے تاکہ اُسے اندازہ ہو کہ اُس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اِس کے نتائج غیر معمولی ہوسکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ اُسے جسمانی سزا دی جائے۔

اِس آخری چیز کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمدن کی تبدیلی کے ساتھ



Marfat.com

ریاست کیا شوہروں کو پابند کر سکتی ہے کہ پہلی دونوں تدابیر اگر موثر نہ ہوں اور سزا کی نوبت آ جائے تو وہ خود کوئی اقدام نہیں کریں گے، بلکہ معاملہ عدالت کے سپرد کر دیں گے؟

ہمارا جواب یہ ہے کہ یقیناً کر سکتی ہے، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کے لیے یہ محض طریق کار کی تبدیلی ہے، اِس سے کوئی حکم معطل نہیں ہوتا۔ عورت کی اصلاح کے لیے سزا شوہر دے، خاندان کے بزرگ دیں یا عدالت، اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ گھر کو بچانے کے لیے اگر سزا بھی دینی پڑے تو دی جائے۔ یہ اصلاح کی ایک تدبیر ہے، اِس سے زیادہ اِس سے کچھ مقصود نہیں ہے۔

[۲۰۰۸ء]

# طلاق کا حق

نکاح محض اِس چیز کا نام نہیں ہے کہ مرد و عورت کا جنسی تعلق قانون کے دائرے میں آ جائے۔ یہ ایک معاہدہ ہے جس سے خاندان کا ادارہ وجود میں آتا ہے۔ یہ ادارہ انسانیت کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اِس کے بغیر انسان کی حیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی ضرورتیں کسی طرح پوری نہیں کی جا سکتیں۔ یہ عورت کے اِس فیصلے سے قائم ہوتا ہے



Marfat.com

کہ وہ برابری کی سطح پر اور ایک دوست کی حیثیت سے نہیں، بلکہ بیوی کی حیثیت سے اپنے آپ کو ایک مرد کے حبالۂ عقد میں دے رہی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ مرد کو اُس نے اُس ادارے کا سربراہ تسلیم کرلیا ہے جو اُن کے باہمی تعلق سے وجود میں آنے والا ہے۔ اِس سے جس طرح یہ ذمہ داری مرد پر عائد ہو جاتی ہے کہ عورت اور اُس کے بچوں کی تمام معاشی ضرورتیں اب وہ پوری کرے گا، اِسی طرح عورت بھی پابند ہو جاتی ہے کہ اگر خدانخواستہ نباہ نہ ہو سکے تو علیحدگی کا کوئی اقدام وہ مرد سے معاملہ کیے بغیر نہ کرے۔ چنانچہ طلاق کی نوبت آجائے تو وہ طلاق دے گی نہیں، بلکہ طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ عام حالات میں توقع یہی ہے کہ ہر شریف النفس آدمی نباہ کی کوئی صورت نہ پا کر یہ مطالبہ مان لے گا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو عورت کیا کرے؟ اِس سوال کا کوئی جواب شریعت نے نہیں دیا، بلکہ زندگی کے بعض دوسرے معاملات کی طرح اِسے ہمارے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ زمانۂ رسالت سے لے کر اب تک جو طریقہ اِس کے لیے اختیار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ عورت اِس طرح کی صورت حال میں عدالت سے رجوع کرتی ہے۔ اِس زمانے میں یہ بہت کچھ باعث زحمت ہو جاتا ہے۔ اِس کا ایک حل یہ سوچا گیا کہ مرد سے منوالیا جائے کہ اُس نے طلاق کا حق عورت کو تفویض کر دیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اِس طرح کا تقاضا خاص کر نکاح کے موقع پر آسان نہیں ہوتا۔ پھر یہ چیز اُس حکمت کو بھی باطل کر دیتی ہے جس کے لیے طلاق کا حق عورت کو نہیں دیا گیا، اِس لیے ہمارا خیال ہے کہ ریاست کی سطح پر یہ قانون



Marfat.com

بنا دینا چاہیے کہ مطالبۂ طلاق کے بعد اگر شوہر نوے دن کے اندر طلاق نہیں دیتا تو نکاح آپ سے آپ فسخ ہو جائے گا اور اموال واملاک سے متعلق اگر کوئی نزاع ہے تو فریقین عدالت سے رجوع کریں گے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اِس وقت جو نکاح نامہ رائج ہے، اُس میں سے حق طلاق کی تفویض کا کالم ختم کر کے درج ذیل عبارت نکاح نامہ کی ابتدا میں درج کر دی جائے:

''یہ نکاح اِس شرط کے ساتھ منعقد ہوا ہے کہ بیوی اگر کبھی تحریری طور پر طلاق کا مطالبہ کرے گی تو شوہر نوے دن کے اندر اُسے طلاق دینے کا پابند ہوگا۔ وہ اگر ایسا نہیں کرے گا تو یہ مدت گزر جانے کے بعد اُس کی طرف سے بیوی پر آپ سے آپ طلاق واقع ہو جائے گی۔ اِس طلاق کے بعد شوہر کے لیے رجوع کا حق نہیں ہوگا اور بیوی پابند ہوگی کہ مہر اور نان ونفقہ کے علاوہ اگر کوئی اموال واملاک شوہر نے اُسے دے رکھے ہیں اور طلاق کے موقع پر وہ اُنھیں واپس لینا چاہتا ہے تو فصل نزاع کے لیے عدالت سے رجوع کرے یا اُس کا مال اُسے واپس کر دے۔''

یہ طریقہ اگر اختیار کر لیا جائے تو عورت اور اُس کے گھر والوں کو کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرنا پڑے گا جو نکاح کے موقع پر کسی بدمزگی کا باعث بن جائے۔ شوہر کو نوے دن کی مہلت مل جائے گی جس میں وہ عورت کو یہ مطالبہ واپس لینے کے لیے آمادہ کر سکتا ہے۔



Marfat.com

طلاق شوہر کی طرف سے ہوگی، اِس لیے وہ تمام حکم و مصالح اپنی جگہ قائم رہیں گے جو اللہ تعالیٰ کے قانون میں ملحوظ ہیں۔

[۲۰۰۸ء]

# طلاق کے غلط طریقے

اسلامی شریعت میں بیوی کو طلاق دینے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، اُس کی رو سے کسی شخص کو حق نہیں کہ وہ عدت کا لحاظ کیے بغیر بیوی کو طلاق دے، اشتعال کی حالت میں طلاق طلاق کے الفاظ منہ سے نکال دے، طلاق پر گواہ نہ بنائے، بیوی ایام سے ہو یا کسی طہر میں اُس سے ملاقات ہو چکی ہو اور طلاق کا فیصلہ سنا دے، ایک ہی وقت میں دو طلاق یا تین طلاق کے الفاظ زبان سے کہہ دے یا لکھ کر بھیج دے۔ یہ سب طریقے سخت ناپسندیدہ ہیں۔ اِن میں سے جو چیز بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا آپ کے سامنے کسی شخص سے صادر ہوئی، آپ نے اُس پر سخت ناراضی کا اظہار کیا ہے، یہاں تک کہ ایک موقع پر فرمایا: کیا اللہ کے قانون سے کھیلا جائے گا، دراں حالیکہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں*؟

* نسائی، رقم ۳۴۳۰۔



Marfat.com

اِس کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں نوے فیصد لوگ طلاق دیتے وقت اِنھی جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ گذشتہ تیس برس کی پبلک زندگی میں طلاق کے جتنے معاملات بھی سامنے آئے، ایک دو کو چھوڑ کر طلاق دینے والوں نے اِن میں سے کسی نہ کسی جرم کا ارتکاب ضرور کیا تھا۔ یہ چیز نہایت تشویش ناک ہے۔ لیکن کیا اِس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ جان بوجھ کر خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں؟ اُنھیں حرام و حلال کی کوئی پروا نہیں رہی؟ وہ خدا سے بے خوف ہو چکے ہیں؟ اُنھیں اِس بات کا کوئی احساس نہیں ہے کہ ایک دن خدا کے حضور میں جواب دہ ہونا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ اِن میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ لوگ اِن جرائم کے مرتکب اِس لیے نہیں ہوتے کہ خدا کے مقابلے میں سرکشی پر آمادہ ہیں، بلکہ بالکل نادانستہ اِن کا ارتکاب کرتے ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً، اُن کی ایک بڑی تعداد اِس بات سے واقف ہی نہیں ہوتی کہ خدا کی شریعت میں یہ چیزیں ممنوع قرار دی گئی ہیں۔ ثانیاً، علما و فقہا نہ صرف یہ کہ اِن جرائم پر لوگوں کو متنبہ نہیں کرتے، بلکہ اِس طریقے سے دی گئی ہر طلاق کو نافذ بھی کر دیتے ہیں۔ ثالثاً، طلاق دینے والا کسی وثیقہ نویس، نکاح رجسٹرار یا کسی وکیل کے پاس جائے اور طلاق کی دستاویز لکھوائے تو وہ بھی اِن میں سے کسی چیز کا لحاظ کیے بغیر ایک ہی وقت میں تین طلاق کی دستاویز لکھ کر اُس کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ چیز اتنی عام ہو چکی ہے کہ آپ شاذ کسی ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جس نے خدا کی شریعت کے مطابق اور اُس کے مقرر کردہ آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے طلاق دی ہو۔



Marfat.com

اِس کے نتائج بھی نہایت افسوس ناک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قانون میں جو مصالح ملحوظ ہیں، وہ سب برباد ہو جاتے ہیں۔ رجوع، موافقت اور گھر کو تباہی سے بچانے کے سب مواقع ختم ہو جاتے ہیں۔ بچوں، بڑوں اور دوست احباب کسی کے لیے مصالحت کرانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ خاندانوں میں مستقل طور پر جھگڑوں کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ لوگ اپنے کیے کی تلافی کے لیے علما سے رجوع کریں تو اُنھیں حلالے کا مشورہ ملتا ہے، جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اُس کے کرنے والے اور کرانے والے، دونوں پر خدا کی لعنت ہے*۔ غرض یہ کہ دو لفظ زبان سے نکلتے ہیں اور ساری عمر کے پچھتاووں کا باعث بن جاتے ہیں۔

اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے درج ذیل اقدامات ضروری ہیں:

۱۔ علما و فقہا اپنے خطبات جمعہ میں، اپنی مجالس وعظ و تذکیر میں، اپنے دروس تعلیم و تربیت میں ہر جگہ لوگوں کو اِن غلطیوں پر متنبہ کریں، اِن کی شناعت بتائیں، اِن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات تواتر کے ساتھ اُن کے سامنے رکھیں اور اُنھیں بتائیں کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ ہمیشہ ایک طلاق دی جائے اور جب دی جائے، ٹھنڈے دل و دماغ سے، سوچ سمجھ کر، دو گواہوں کی موجودگی میں، عدت کے حساب سے اور حیض سے فراغت کے بعد بیوی سے زن و شو کا تعلق قائم کیے بغیر دی جائے۔

---

* ابن ماجہ، رقم ۱۹۳۶۔



Marfat.com

۲۔ نکاح نامے کی طرح حکومت کی طرف سے ایک معیاری طلاق نامہ شائع کر کے نکاح رجسٹرار کے پاس رکھوا دیا جائے اور لوگوں کو پابند کیا جائے کہ وہ اُسی کو پر کر کے طلاق دیں۔ جو شخص اِس کی خلاف ورزی کرے، اُسے لازماً کوئی سزا دی جائے۔

۳۔ علما و فقہا اور عدالتیں غلط طریقے سے دی گئی طلاق کو نافذ قرار دینے کے بجاے وہی طریقہ اختیار کریں جو اِس طرح کے مقدمات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا۔ اِن میں سے دو نہایت اہم ہیں۔

پہلا مقدمہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اُنھوں نے ایام حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ آپ اِسے سن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: اِسے حکم دو کہ رجوع کرے، پھر اپنی زوجیت میں روکے رکھے، یہاں تک کہ وہ پاک ہو، پھر حیض آئے، پھر پاک ہو۔ اِس کے بعد چاہے تو روک لے اور چاہے تو ملاقات سے پہلے طلاق دے دے۔ اِس لیے کہ یہی اُس عدت کی ابتدا ہے جس کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کی ہدایت فرمائی ہے*۔

دوسرا مقدمہ رکانہ بن عبد یزید کا ہے۔ روایتوں کو جمع کرنے سے واقعے کی جو صورت سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دیں۔ پھر نادم ہوئے اور اپنا معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ

* بخاری، رقم ۵۲۵۱۔ مسلم، رقم ۳۶۵۷۔



Marfat.com

نے پوچھا: طلاق کس طرح دی ہے؟ اُنھوں نے عرض کیا: ایک ہی وقت میں بیوی کو تین طلاق دے بیٹھا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ارادہ کیا تھا؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ ارادہ تو ایک ہی طلاق دینے کا تھا۔ آپ نے قسم دے کر پوچھا اور اُنھوں نے قسم کھالی تو آپ نے فرمایا: یہ بات ہے تو رجوع کرلو۔ یہ ایک ہی طلاق ہوئی ہے۔ اُنھوں نے عرض کیا: لیکن میں نے تو، یا رسول اللہ، تین طلاق کہا تھا۔ آپ نے فرمایا: میں جانتا ہوں، تم رجوع کرلو، یہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عورتوں کو طلاق دو تو اُن کی عدت کے لحاظ سے طلاق دو*۔

[۲۰۱۰ء]

# سر کی اوڑھنی

اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے سوا جسم کے کسی حصے کی زیبایش، زیورات وغیرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہیں کھولیں گی۔ قرآن نے اِسے لازم ٹھیرایا ہے۔ سر پر دوپٹا یا اسکارف اوڑھ کر باہر نکلنے کی روایت اِسی سے قائم ہوئی ہے اور اب اسلامی تہذیب کا حصہ بن چکی ہے۔ عورتوں نے

* ابوداؤد، رقم ۲۱۹۶، ۲۲۰۶۔ ابن ماجہ، رقم ۲۰۵۱۔ ترمذی، رقم ۱۱۷۷۔ احمد، رقم ۲۳۸۳۔ یہ روایتیں سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں، لیکن اِن کو جمع کیا جائے تو ضعف کا ازالہ ہوجاتا ہے۔



Marfat.com

زیورات نہ پہنے ہوں اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو وہ اِس کا اہتمام کرتی رہی ہیں۔ یہ رویہ بھی قرآن ہی کے اشارات سے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دوپٹے سے سینہ اور گریبان ڈھانپ کر رکھنے کا حکم اُن بوڑھیوں کے لیے نہیں ہے جو نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، بشرطیکہ وہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ وہ اپنا یہ کپڑا مردوں کے سامنے اتار سکتی ہیں، اِس میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر ساتھ ہی وضاحت کر دی ہے کہ پسندیدہ بات اُن کے لیے بھی یہی ہے کہ احتیاط کریں اور دوپٹا سینے سے نہ اتاریں۔ اِس سے واضح ہے کہ سر کے معاملے میں بھی پسندیدہ بات یہی ہونی چاہیے اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو عورتوں کو دوپٹا سر پر اوڑھ کر رکھنا چاہیے۔ یہ اگرچہ واجب نہیں ہے، لیکن مسلمان عورتیں جب مذہبی احساس کے ساتھ جیتی اور خدا سے زیادہ قریب ہوتی ہیں تو وہ یہ احتیاط لازماً ملحوظ رکھتی ہیں اور کبھی پسند نہیں کرتیں کہ کھلے سر اور کھلے بالوں کے ساتھ اجنبی مردوں کے سامنے ہوں۔

[۲۰۰۸ء]

# نیل پالش

عورتیں اپنے ناخن کسی نہ کسی چیز سے رنگتی رہی ہیں۔ ہمارے زمانے میں اِس کے



Marfat.com

لیے مختلف اقسام کی نیل پالش ایجاد ہوگئی ہیں۔ مہندی وغیرہ کے برعکس اِس کی موٹی تہ چونکہ ناخن پر جمالی جاتی ہے، اِس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ اِس کے ساتھ وضو کا کیا کیا جائے؟ اِس کے تین جواب دیے گئے ہیں:

ایک یہ کہ نیل پالش پر وضو نہیں ہوتا، اس لیے ہر وضو سے پہلے اِسے لازماً اتارنا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ نیل پالش لگانے کے بعد بھی ہاتھ ہاتھ ہی ہوتا ہے، اِس لیے وضو ہو جائے گا۔ اِسے اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تیسرا یہ کہ اِسے جرابوں کے مسح پر قیاس کرنا چاہیے۔ چنانچہ نیل پالش اگر وضو کر کے لگائی گئی ہے تو اتارنے کی ضرورت نہیں ہے، اِس کے اوپر ہی وضو کر لیا جائے گا، لیکن وضو کے بغیر لگائی گئی ہے تو اِسے اتار کر وضو کرنا چاہیے۔

ہمارے نزدیک یہی تیسرا مسلک قابل ترجیح ہے۔ یہ احتیاط کا مسلک ہے، اِس میں کوئی مشقت بھی نہیں ہے اور تزکیہ و تطہیر کے مقصد سے بھی یہ زیادہ قریب ہے۔ اِس لیے بہتر یہی ہے کہ عورتیں اپنے پروردگار کے حضور میں حاضری کے لیے اِس کا اہتمام کر لیں۔

[۲۰۰۸ء]



Marfat.com

# عورتوں کا سفر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے عورتوں کو محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا اور فرمایا ہے کہ اِس طرح کا سفر اُن کے لیے جائز نہیں ہے۔ اِس کی مدت بعض روایتوں میں ایک، بعض میں دو اور بعض میں تین شب و روز بیان ہوئی ہے۔* یہ سدِ ذریعہ کی ہدایت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز سے روکا گیا ہے، وہ اصلاً ممنوع نہیں ہے، لیکن ممنوعات میں سے کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اِس کے مخاطبین بھی افراد بحیثیت افراد ہیں۔ اِس میں ریاست سے یہ تقاضا نہیں کیا گیا کہ وہ کسی عورت کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں دے گی۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ اِس طرح کی ہدایات ہمیشہ حالات سے متعلق ہوتی ہیں۔ اسلام میں عورت کی عفت و عصمت کو جو اہمیت حاصل ہے، اُس کے پیش نظر ضروری تھا کہ زمانۂ رسالت کے حالات میں اُنھیں محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا جائے۔ اُس زمانے میں سفر پیدل یا اونٹ گھوڑوں پر کیا جاتا تھا۔ جن مقامات تک اب ہم گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں، اُس وقت وہاں پہنچنے میں ہفتے، بلکہ مہینے لگ جاتے تھے۔ مسافر تنہا یا قافلوں میں سفر کرتے

---

* بخاری، رقم ۱۰۸۶۔ مسلم، رقم ۳۲۷۰۔



Marfat.com

اور بعض اوقات جنگلوں اور بیابانوں سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچتے تھے۔ رات آجاتی تو کھلے آسمان تلے قافلوں میں یا اجنبی شہروں کی سرایوں میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اِس طرح کے حالات میں اگر عورتوں کی حفاظت کے پیش نظر اور اُنھیں کسی تہمت سے بچانے کے لیے پابند کیا گیا کہ وہ محرم کے بغیر سفر نہ کریں تو اِس کی حکمت ہر سلیم الطبع آدمی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔

دورِ حاضر نے اِس کے برخلاف سفر کے ذرائع میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا ہے۔ مہینوں کا سفر اب گھنٹوں میں ہوتا ہے۔ ریل، جہاز اور بسوں میں حفاظت کے غیر معمولی انتظامات ہیں۔ ہوٹلوں اور سرایوں وغیرہ کا نظم بھی بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔ آج سے سو سال پہلے اپنی بہن یا بیٹی کو تنہا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھیجنے میں بھی تردد ہوتا تھا، لیکن اب یورپ اور امریکا کے سفر میں بھی اِس طرح کا کوئی تردد محسوس نہیں ہوتا۔ حج کا سفر بھی آخری درجے میں محفوظ ہو چکا ہے اور عورتیں اپنی شناسا عورتوں کی معیت میں نہایت اطمینان کے ساتھ حجاز مقدس جا سکتی اور حج وعمرہ کے مناسک ادا کر سکتی ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی تقاضا کرتی ہے کہ حکم کو دور حاضر کے سفروں سے متعلق نہ سمجھا جائے اور عورتوں کو اجازت دی جائے کہ خطرے کی کوئی جگہ نہ ہو تو اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے وہ تنہا یا عورتوں کی معیت میں جس طرح چاہیں، سفر کریں، تاہم اتنی بات ملحوظ رکھیں کہ اُن کی عزت ہر حال میں محفوظ رہے اور گھروں سے نکلتے وقت اُن سے کوئی غفلت نہ ہو۔ وہ اگر اللہ اور اُس کے رسول کو ماننے والی ہیں تو اِس



Marfat.com

معاملے میں اُنھیں بے پروانہیں ہونا چاہیے۔

[۲۰۰۹ء]

# اسقاط حمل

استقرار حمل پر ۱۲۰ دن گزر جائیں تو اُس کا اسقاط کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ اِس مدت کے بعد جنین کا قتل درحقیقت انسان کا قتل ہے جو قرآن مجید کی رو سے پوری انسانیت کو قتل کر دینے کے مترادف ہے۔ اِس کی سزا قرآن میں ابدی جہنم بیان کی گئی ہے۔ اِس سے پہلے اسقاط، البتہ مباح ہے۔ مگر یہ اباحت بھی علی الاطلاق نہیں ہو سکتی، اِس کے لیے کوئی معقول عذر اور حقیقی سبب لازماً ہونا چاہیے۔ فقہ اسلامی میں اسقاط کے لیے ۱۲۰ دن کی یہ مدت اِس لیے مقرر کی گئی ہے کہ بچے کو انسانی شخصیت اِسی مدت کے خاتمے پر دی جاتی ہے۔ اِس سے پہلے وہ ایک حیوانی وجود ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی بھی حیوانی زندگی ہوتی ہے۔ ۱۲۰ دن کی اِس مدت میں اُس کا حیوانی قالب پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے انسانی شخصیت عطا فرماتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے قرآن میں جنین کو ایک دوسری مخلوق میں تبدیل کر دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:



Marfat.com

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ، ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا، فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا، ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ.

(المومنون ۲۳: ۱۲-۱۴)

''ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا، پھر اُس کو ایک محفوظ جگہ پانی کی بوند میں تبدیل کر دیا، پھر اس بوند کو جنین کی صورت دی، پھر جنین کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے میں ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھادیا، پھر اُس کو ایک بالکل ہی دوسری مخلوق میں تبدیل کر دیا۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا۔''

ابتدا میں انسان کو زمین کے پیٹ سے پیدا کیا گیا تو اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ پہلے انسان کا حیوانی وجود تخلیق ہوا، پھر اُس میں اپنی نسل آپ پیدا کر لینے کی صلاحیت ودیعت ہوئی، پھر اُس کا تسویہ کیا گیا، اِس طریقے سے جو مخلوق وجود میں آئی، اُس میں سے دو کا انتخاب کر کے پھر اُن میں روح پھونکی گئی، جس سے آدم وحوا کی صورت میں نطق و بیان کی صلاحیت اور عقل و شعور سے بہرہ یاب ایک نئی مخلوق، یعنی انسان کی ابتدا ہوگئی:

بَدَاَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ، ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ

''اُس نے انسان کی تخلیق کا آغاز مٹی سے کیا، پھر اُس کی نسل حقیر پانی کے



Marfat.com

مَّآءٍ مَّهِيْنٍ، ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ، قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ. (السجدہ۳۲: ۷-۹)

خلاصے سے چلائی، پھر اُس کو نک سک سے درست کیا اور اُس میں اپنی روح پھونک دی اور (اِس طرح) تم کو کان اور آنکھیں اور دل عطا فرمائے۔ تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے کہ ماں کے پیٹ میں انسان کے حیوانی وجود کی تخلیق کے یہ تمام مراحل ۱۲۰ دن میں مکمل ہوتے ہیں۔ اِس کے بعد روح پھونکی جاتی ہے اور خدا کے حکم سے وہ شخصیت وجود میں آ جاتی ہے جسے ہم انسان کہتے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

إن أحدكم يجمع خلقه في بطن أمه أربعين يومًا، ثم يكون في ذلك علقة مثل ذلك، ثم يكون في ذلك مضغة مثل ذلك، ثم يرسل الملك فينفخ فيه الروح. (مسلم، رقم ۲۶۴۳)

"تم میں سے ہر ایک کی خلقت ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک ہوتی ہے، پھر اِتنی مدت میں وہ جنین بن جاتا ہے، پھر لوتھڑا بن کر پورا ہو جانے میں بھی اتنے ہی دن لگتے ہیں، پھر فرشتے کو بھیجا جاتا ہے اور وہ اُس میں روح پھونک دیتا ہے۔"

قرآن وحدیث کی یہی تصریحات ہیں جن کی بنا پر اسقاط کے لیے ۱۲۰ دن کی



Marfat.com

مدت مقرر کی گئی ہے۔

[۲۰۰۹ء]

# ضبط ولادت

بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن اُن کی پیدایش کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس ماں باپ کے لیے اور جتنی تعداد میں چاہتا ہے، اُنھیں براہ راست آسمان سے نازل کر دیتا ہے۔ اُن کی پیدایش انسان کی وساطت سے اور اُس کے ارادے، فیصلے اور اقدام کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ انسان کے بارے میں یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ اُس کے خالق نے اُسے عقل و شعور سے نوازا اور ارادہ و اختیار عطا فرمایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں تقاضا کرتی ہیں کہ اپنے ہر فیصلے سے پہلے وہ اُس کے نتائج و عواقب کا جائزہ لے، علم و عقل کی روشنی میں معاملے کو سمجھے اور اِس کے بعد اقدام کرے۔ اِسے باغبان کی مثال سے سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ* (یہ کھیتی تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں)؟ مدعا یہ ہے کہ باغ اور کھیتیاں تم نہیں، بلکہ خدا اگاتا ہے۔ لیکن اِس کے معنی کیا یہ ہیں کہ باغبان کا کام صرف

---

* الواقعہ ۵۶: ۶۴۔



Marfat.com

بیج بکھیر دینا یا پنیری جما دینا ہے؟ ہر شخص مانے گا کہ ہرگز نہیں، اُس کی ذمہ داری ہے کہ باغ لگانے سے پہلے دیکھے کہ جو درخت وہ بونے جا رہا ہے، اُن کی کاشت، نگہداشت اور اُن میں پھل آنے کے بعد اُسے درختوں سے اتارنے اور منڈی تک پہنچانے کے اخراجات ولوازم کا تحمل، کیا اُس کے لیے ممکن ہے؟ اُس نے زمین تیار کر لی ہے؟ درخت لگاتے وقت اُن کی ضرورت کے لحاظ سے زمین میں فاصلہ چھوڑ دیا ہے؟ اُن کے پھلوں کی منڈی میں مانگ بھی ہے یا نہیں، اِس کے لیے ضروری معلومات فراہم کر لی ہیں؟ یہ سب چیزیں دیکھنے کے بعد فیصلہ کرے کہ اُسے کیا بونا ہے اور کب بونا ہے اور کچھ بونا بھی ہے یا نہیں؟ ضبط ولادت کے معاملے میں لوگ جائز اور ناجائز کی بحث کرتے ہیں، دراں حالیکہ اِن سب چیزوں کو دیکھنا جس طرح باغبان کے لیے ضروری ہے، اِسی طرح بچے کے والدین کے لیے بھی ضروری ہے۔ اِنھیں باغبان نہیں دیکھے گا تو وہ بھی اِس کے نتائج بھگتے گا اور والدین نہیں دیکھیں گے تو وہ بھی بھگتیں گے۔

ہمارے معاشرے میں اِس کی مثالیں جگہ جگہ دیکھ لی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ بچے کی تمہید باندھنے سے پہلے والدین اِس بات کا جائزہ لیں کہ ماں بچے کا تحمل کر سکتی ہے؟ اُس کی صحت اِس قابل ہے کہ پیدایش اور پرورش کا بوجھ اُٹھا سکے؟ اِس سے پہلے اگر کوئی بچہ ہے تو اُس سے اِس حد تک فارغ ہو چکی ہے کہ دوسرے بچے کی نگہداشت کر سکے؟ اپنے زمانے اور حالات کے لحاظ سے ماں باپ کیا بچے کی نشوونما



Marfat.com

اور تعلیم وتربیت کے لیے وقت، فرصت اور ضروری وسائل رکھتے ہیں؟ اِن سوالوں کا جواب اگر نفی میں ہے تو ضبطِ نفس سے کام لینا چاہیے یا منع حمل کا کوئی طریقہ اختیار کر لینا چاہیے، مگر بچے کی تمہید ہرگز نہیں باندھنی چاہیے۔

تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارا یہ فیصلہ خدا کے کسی فیصلے کو روک سکتا ہے۔ اُس کی حکمت کا تقاضا اگر یہ ہے کہ بچے کو دنیا میں آنا ہے تو وہ آ کر رہے گا۔ ہماری یہ تدبیریں اُس کے قانون کی پیروی کے لیے ہیں، اُس کے کسی فیصلے کو روکنے کے لیے نہیں ہیں۔ بیماری خدا کے اذن سے آتی ہے، مگر حفظانِ صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کی جائے تو عام قانون یہی ہے کہ بیماری آئے گی۔ شفا خدا کے ہاتھ میں ہے، مگر علاج نہ کیا جائے تو عام قانون یہی ہے کہ بیماری بڑھے گی۔ رزق خدا ہی دیتا ہے، مگر عام قانون یہی ہے کہ اُس کے لیے جدوجہد کی جائے تو ملتا ہے۔ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور انسان کو یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ اپنی عقل کے مطابق اِن اسباب کو استعمال کرے۔ خدا کی تقدیر یہاں بہت سے معاملات میں ہمارے ارادوں، فیصلوں اور اقدامات سے متعلق ہوتی ہے۔ سیدنا عمر نے طاعون کی جگہ سے بھاگنے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم خدا کی تقدیر سے خدا کی تقدیر کی طرف جا رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب آپ سے منع حمل کی ایک تدبیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اِسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:



Marfat.com

| | |
|---|---|
| مامن کل الماء یکون الولد، وإذا أراد اللّٰه خلق شئ لم یمنعه شئ. (مسلم، رقم ۱۴۳۸) | ''ہر نطفے سے اولاد نہیں ہوتی، مگر اللہ جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔'' |

[۲۰۱۰ء]

# حفظ فروج

اسلامی شریعت تسکین شہوت کے لیے بیویوں کے سوا کسی کے ساتھ کوئی تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسے حرام قرار دیا ہے اور سورۂ مومنون میں پوری وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ قضائے شہوت کے لیے جو لوگ اِن کے ماسوا کسی سے تعلق قائم کریں گے، وہ خدا کے حدود سے تجاوز کے مجرم ہوں گے۔ زمانۂ رسالت کی جن لونڈیوں کے لیے اُس وقت تک آزادی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی، وہ، البتہ اِس حکم سے مستثنیٰ تھیں اور لوگ چاہتے تو اُن کے ساتھ بھی یہ تعلق قائم کر سکتے تھے۔ ارشاد فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ | ''اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت |



Marfat.com

اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ، فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ، فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ. (المومنون۲۳:۵-۷)

کرتے ہیں، اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے سوا، اِس لیے کہ اُن کے معاملے میں اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ ہاں، جو اِن کے علاوہ کچھ چاہیں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

آیت کا مدعا یہی ہے، مگر اِس سے بعض فقہا نے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ اِس میں بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا قضاے شہوت کے تمام طریقے حرام قرار دیے گئے ہیں، لہٰذا زنا، عمل قوم لوط اور وطی بہائم کی طرح جلق (masturbation) کی مختلف صورتیں بھی قطعاً حرام ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو رعایت اِس معاملے میں دی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اِن کی حرمت زنا اور عمل قوم لوط اور وطی بہائم کی بہ نسبت کم تر سمجھی جائے اور اِن گناہوں سے بچنے کے لیے لوگ اگر اِس طریقے سے اپنے جوش طبع کی تسکین کر لیں تو اُن کے حق میں توقع رکھی جائے کہ شاید اللہ تعالیٰ اُنھیں سزا نہ دے۔

ہمارے نزدیک یہ استدلال عربیت کی رو سے نہایت کمزور، بلکہ غلط ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں 'عَلٰی' 'حٰفِظُوْنَ' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا، اِس لیے یہاں لازماً تضمین ہے اور 'حٰفِظُوْنَ' کے بعد 'عن الوقوع علی أحد' یا اِس کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ مستثنیٰ منہ استمنا کے طریقے نہیں، بلکہ افراد ہیں جن سے کوئی شخص جنسی تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ آیت کے معنی یہ نہیں



Marfat.com

ہو سکتے کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا قضاے شہوت کا کوئی طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ ہوں گے کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا کسی سے قضاے شہوت کرنا جائز نہیں ہے۔ آیت کی صحیح تاویل یہ ہے، لہٰذا پورے اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی نص صریح یا قاعدۂ کلیہ ایسا نہیں ہے جس کے تحت استمنا بالید کو حرام یا مکروہ ٹھیرایا جائے۔ یہی صورت حدیث کی ہے۔ اِس کے ذخائر بھی اِس کے متعلق کسی ایسی روایت سے خالی ہیں جو محدثین کے نزدیک قابل قبول ہو۔ چنانچہ اِس معاملے میں صحیح مسلک وہی ہے جو امام ابن حزم نے اپنی کتاب ''المحلی''* میں پورے دلائل کے ساتھ پیش فرمایا ہے، پھر سند کے ساتھ بتایا ہے کہ حسن بصری، عمرو بن دینار، زیاد ابو العلا اور مجاہد جیسے بزرگ بھی استمنا بالید کی اباحت کے قائل تھے جو اِس طرح کی چیزیں بالعموم صحابۂ کرام ہی سے روایت کرتے ہیں۔

[۲۰۱۰ء]

# مباشرت کے حدود

دین کا مقصد تزکیہ ہے۔ وہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ بیوی کے ساتھ منہ یا دبر کے راستے سے جنسی تعلق قائم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ عورتوں سے ملاقات لازماً

* ۲۲۱/۱۳۔



Marfat.com

اُسی راستے سے ہونی چاہیے جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ*' (تو اُن سے ملاقات کرو، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے)۔ یہ چیز بدیہیات فطرت میں سے ہے اور اِس پہلو سے، لاریب خدا ہی کا حکم ہے۔ اگر کوئی شخص اِس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ درحقیقت خدا کے ایک واضح، بلکہ واضح تر حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے، اور اِس پر یقیناً اُس کے ہاں سزا کا مستحق ہوگا۔

یہ آیت جہاں آئی ہے، قرآن نے یہی بات اِس کے بعد کھیتی کے استعارے سے واضح فرمائی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''عورتوں کے لیے کھیتی کے استعارے میں ایک سیدھا سادہ پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لیے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے، نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں، کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے، کوئی کسان اِس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اِسی طرح عورت کے لیے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے زمانے میں یا کسی غیر محل میں اُس سے قضائے شہوت نہ کی جائے، اِس لیے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جمام اور غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے، اور غیر محل میں مباشرت باعث اذیت و اضاعت ہے۔ اِس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے اِس کا ارتکاب جائز

* البقرہ ۲: ۲۲۲۔



Marfat.com

نہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۲۷)

اِس کے بعد فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ* ''(لہٰذا تم اپنی اِس کھیتی میں جس طرح چاہے، آؤ) کی وضاحت میں اُنھوں نے لکھا ہے:

''...(اِس) میں یہ بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اُس آزادی، بے تکلفی، خودمختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے، اور دوسری اُس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اِس دوسری چیز کی طرف 'حَرْث' کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف 'اَنّٰى شِئْتُمْ' کے الفاظ۔ وہ آزادی اور یہ پابندی، یہ دونوں چیزیں مل کر اُس رویے کو متعین کرتی ہیں جو ایک شوہر کو بیوی کے معاملے میں اختیار کرنا چاہیے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اِس اطمینان میں ہے کہ اُن کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اِس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اِس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اِس نشہ سے سرشار ہو، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اُس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں، بلکہ اُس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں، بلکہ اُس کی اپنی کھیتی ہے، اِس وجہ سے وہ اِس میں آنے کو

* البقرہ ۲:۲۲۳۔



Marfat.com

تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے، لیکن اس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے۔ اِس کے کسی آنے میں بھی اِس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔" (تدبر قرآن ۱/۵۲۷)

یہ ہدایات کس درجہ اہمیت رکھتی ہیں؟ قرآن نے سورۂ بقرہ کی اِنھی آیات میں اِسے 'اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيۡنَ وَيُحِبُّ الۡمُتَطَهِّرِيۡنَ'* (بے شک، اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ آیت کے اِس حصے کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح کی ہے:

"...توبہ اور تطہر کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے۔ اِس اعتبار سے دونوں کی حقیقت ایک ہوئی اور مومن کی دونوں خصلتیں اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ اِس کے برعکس جو لوگ اِن سے محروم ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ یہاں جس سیاق میں یہ بات آئی ہے، اُس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو لوگ عورت کی ناپاکی کے زمانے میں قربت سے اجتناب نہیں کرتے یا قضاے شہوت کے معاملے میں فطرت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں، وہ اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔" (تدبر قرآن ۱/۵۲۶)

[۲۰۱۰ء]

---

* البقرہ ۲: ۲۲۲۔



Marfat.com

# ایصال ثواب

اللہ تعالیٰ نے یہ بات قرآن مجید میں بطور اصول واضح کر دی ہے کہ ہر شخص اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ کسی شخص کے فعل کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ڈالی جاسکتی اور نہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے فعل کی ذمہ داری اپنے اوپر لے سکتا ہے۔ اِسی طرح یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ قیامت میں جس شخص کو جو کچھ بھی ملے گا، اُس کے عمل کے صلے میں ملے گا۔ ایک شخص کے عمل کا صلہ دوسرا نہیں پا سکتا۔ سعی و عمل کے بغیر وہاں کسی کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی، وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰی، ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی۔

(النجم ۵۳: ۳۸-۴۱)

''یہ کہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور یہ کہ انسان کو (آخرت میں) وہی ملے گا جو اُس نے (دنیا میں) کمایا ہے اور جو کچھ اُس نے کمایا ہے، وہ عنقریب دیکھا جائے گا، پھر اُس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔''



Marfat.com

اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ انسان کے عمل کی صورت نہیں ہے جو خدا کے ہاں پہنچتی اور اُسے اجر کا مستحق بناتی ہے، بلکہ دل کا تقویٰ ہے جو باعث اجر ہوتا ہے۔ یہ تقویٰ، ظاہر ہے کہ کوئی قابل انتقال چیز نہیں ہے۔ اِس کی جگہ انسان کا دل ہے۔ اِسے وہاں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی دوسرا شخص بھی اِس کے ثمرات میں سے کچھ حصہ پا سکے۔ قربانی ایک عظیم عبادت ہے۔ اُس میں ہم اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے اُس کو اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔ اُس کے بارے میں فرمایا ہے:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا، وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ. (الحج ۲۲: ۳۷)

''اللہ کو (تمھاری) اِن (قربانیوں) کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ اُس کو صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''

قرآن کے یہ دونوں مقامات پیش نظر ہوں تو دوسروں کی نیکی یا بدی سے آدمی کو خدا کے ہاں کسی فائدے یا نقصان کے پہنچنے کی ایک ہی شکل باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اُس کی نیت، ارادے اور سعی و جہد کو بالواسطہ یا بلاواسطہ اُس نیکی یا بدی میں دخل ہو۔ اِس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً یہ کہ اُس نے کسی کو خیر و صلاح کی تعلیم دی ہو یا اپنے عملی نمونے سے نیکی کے کسی کام کی مثال قائم کی ہو یا اُس کے لیے اسباب و وسائل فراہم کرنے میں اُس کا کوئی حصہ رہا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر فرمایا ہے:



Marfat.com

إذا مات الإنسان إنقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية، أوعلم ينتفع به، أوولد صالح يدعوله. (مسلم، رقم ۴۲۳۲)

''انسان مرجاتا ہے تو اُس کا عمل بھی اُس کے ساتھ ہی منقطع ہو جاتا ہے۔ تین چیزیں، البتہ مستثنیٰ ہیں: ایک صدقہ جاریہ، دوسرے علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، تیسرے صالح اولاد جو والدین کے لیے دعا کرتی رہے۔''

اِن میں اولاد کے ذکر پر کسی کو تعجب نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سراسر والدین کی سعی ہے، اِس لیے کہ والدین اگر سچے مومن ہیں تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے تمام اعمال خیر کی تعلیم سب سے پہلے وہی اولاد کو دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اگر نیکی کے کسی کام سے معذور ہو جائیں تو اِس میں کوئی حرج نہیں کہ اُن کے کسی ارادۂ خیر کو اولاد پایۂ تکمیل تک پہنچا دے، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے پہنچانا چاہیے، اِس لیے کہ یہی سعادت مندی کا تقاضا ہے۔ نیت اور ارادے کے ساتھ اِس سے اُنھیں تعمیل کا اجر بھی مل جائے گا۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ قبیلۂ خثعم کی ایک عورت نے پوچھا: یارسول اللہ، میرے باپ پر حج فرض ہے، مگر وہ اتنا بوڑھا ہے کہ سواری پر ٹھیر بھی نہیں سکتا، کیا میں اُس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: کر سکتی ہو*۔ اِسی طرح جہینہ کی ایک عورت نے حضور سے پوچھا: میری ماں نے

* بخاری، رقم ۱۸۵۵۔ مسلم، رقم ۳۲۵۱۔



Marfat.com

حج کی نذر مانی تھی، اب وہ دنیا سے رخصت ہو گئی ہے، کیا میں اُس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ضرور کرو، کیا اُس پر قرض ہوتا تو تم ادا کرتیں؟ یہ اللہ کا قرض ہے، اِسے بھی ادا کرو، اِس لیے کہ اللہ اِس کا زیادہ حق دار ہے کہ اُس کا قرض ادا کیا جائے*۔

انسان کی زندگی میں یہی حیثیت والدین کے علاوہ کسی دوسرے شخص، مثلاً کسی استاذ یا کسی بزرگ کی بھی ہو سکتی ہے۔ اُس کا حکم بھی، ظاہر ہے کہ یہی ہونا چاہیے۔ اِس مضمون کی تمام روایتیں اِسی ضابطے پر محمول ہیں۔ اِس کے بغیر اگر کسی کے لیے کوئی عمل کیا جاتا ہے تو اُس کا اجر پھر اُسی کے لیے ہے جس نے وہ عمل کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک عورت نے اپنا بچہ آپ کی طرف اٹھایا اور پوچھا: کیا یہ بھی حج کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، لیکن اِس کا اجر تمھارے لیے ہے**۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس کے لیے نیکی کی گئی ہے، اُس کو اجر ملنے کا امکان نہ بھی ہو تو نیکی کے کام میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اُس کا اجر نیکی کرنے والے کو ہر حال میں مل جائے گا۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُن تقریبات کے لیے بھی اِس سے کوئی جواز پیدا کیا جا سکتا ہے جو ایصال ثواب کے نام پر اِس وقت مسلمانوں میں رائج ہو چکی ہیں۔

---

* بخاری، رقم ۱۸۵۲۔

** مسلم، رقم ۳۲۵۳۔



Marfat.com

اِس طرح کی تقریبات یقیناً بدعت ہیں۔قرآن وحدیث میں اِن کے لیے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جاسکتی۔

اِس معاملے میں یہ بات، البتہ ملحوظ رہنی چاہیے کہ 'لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی' میں نفی کا اسلوب نفی استحقاق کے لیے ہے اور یہ ضابطہ اُسی موقع سے متعلق ہے، جب لوگوں کے لیے جنت اور جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اپنے ایمان و عمل سے جنت کا استحقاق پیدا کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ کے افضال وعنایات سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں صراحت ہے کہ اولاد اگر اپنے ایمان کی بنیاد پر کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں بھی جنت کی مستحق ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ اُس کے والدین پر اتمام نعمت کے لیے اُسے وہی درجہ عطا فرما دیں گے جو اُس کے والدین کا ہے اور دونوں کو ایک ہی جگہ اکٹھا کر دیں گے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَاتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّیَّتُهُمۡ بِاِیۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَمَاۤ اَلَتۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَمَلِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ. (الطور ۵۲:۲۱)

''جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اُن کی اولاد بھی کسی درجۂ ایمان میں اُن کے نقش قدم پر چلی ہے، اُن کی اِس اولاد کو بھی ہم (اُنھی کے درجے میں) اُن کے ساتھ ملا دیں گے اور اُن کے عمل میں کوئی کمی نہ کریں گے۔''

اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہی معاملہ اُس صورت میں بھی ہونا چاہیے، جب والدین کسی نیچے کے درجے میں ہوں گے، اِس لیے کہ والدین اور اولاد کا جو تعلق خاطر



Marfat.com

اولاد کو والدین کے درجے تک اٹھانے کا باعث بن رہا ہے، وہی تعلق خاطر اس دوسری صورت میں بھی موجود ہے۔

[۲۰۱۱ء]

# توہین رسالت کی سزا

[۱]

توہین رسالت کی سزا کا جو قانون ریاست پاکستان میں نافذ ہے، اُس کا کوئی ماخذ قرآن وحدیث میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قانون کہاں سے اخذ کیا گیا ہے؟ اِس سوال کے جواب میں بعض اہل علم نے فرمایا ہے کہ یہ سورۂ مائدہ (۵) کی آیات ۳۳-۳۴ سے ماخوذ ہوسکتا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ مائدہ کی اِن آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے محاربہ اور فساد فی الارض کی سزا بیان فرمائی ہے اور اُس کے رسول کی توہین وتحقیر بھی محاربہ ہی کی ایک صورت ہے۔ آیات یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ | ’’جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول |
| وَرَسُوۡلَہٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ | سے لڑیں گے اور زمین میں فساد برپا |
| فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا | کرنے کی کوشش کریں گے، اُن کی |
| اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَاَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ | سزا پھر یہی ہے کہ عبرت ناک طریقے |
| خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ، | سے قتل کر دیے جائیں یا سولی پر |



Marfat.com

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ، اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ، فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. (۵:۳۳-۳۴)

چڑھائے جائیں یا اُن کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں یا اُنھیں علاقہ بدر کر دیا جائے۔ یہ اُن کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں اُن کے لیے ایک بڑا عذاب ہے، مگر اُن کے لیے نہیں جو تمھارے قابو پانے سے پہلے توبہ کر لیں۔ سو (اُن پر زیادتی نہ کرو اور) اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔''

اِس قانون کے ماخذ سے متعلق دوسرے نقطہ ہاے نظر کی طرح یہ راے بھی ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔

اولاً، اِس لیے کہ آیت میں 'یُحَارِبُوْنَ' کا لفظ ہے۔ یہ لفظ تقاضا کرتا ہے کہ آیت میں جو سزائیں بیان ہوئی ہیں، وہ اُسی صورت میں دی جائیں جب مجرم سرکشی کے ساتھ توہین پر اصرار کرے؛ فساد انگیزی پر اتر آئے؛ دعوت، تبلیغ، تلقین و نصیحت اور بار بار کی تنبیہ کے باوجود باز نہ آئے، بلکہ مقابلے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ آدمی الزام سے انکار کرے یا اپنی بات کی وضاحت کر دے اور اُس پر اصرار نہ کرے تو لفظ کے کسی مفہوم میں بھی اِسے محاربہ یا فساد قرار نہیں دیا جا سکتا۔



Marfat.com

ثانیاً، اِس لیے کہ اقرار و اصرار کے بعد بھی مجرم قانون کی گرفت میں آنے سے پہلے توبہ اور رجوع کر لے تو قرآن کا ارشاد ہے کہ اُس پر حکم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ توبہ کر لینے والوں کو یہ سزائیں نہیں دی جاسکتیں۔ اِس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ کارروائی سے پہلے اُنھیں توبہ واصلاح کی دعوت دینی چاہیے اور بار بار توجہ دلانی چاہیے کہ وہ خدا اور رسول کے ماننے والے ہیں تو اپنی عاقبت برباد نہ کریں اور اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور ماننے والے نہیں ہیں تو مسلمانوں کے جذبات کا احترام کریں اور اِس جرم شنیع سے باز آجائیں۔

ثالثاً، اِس لیے کہ آیت کی رو سے یہ ضروری نہیں ہے کہ اُنھیں قتل ہی کیا جائے۔ اُس میں یہ گنجایش رکھی گئی ہے کہ جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات تقاضا کرتے ہوں تو عدالت اُسے کم تر سزا بھی دے سکتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اِس طرح کے مجرموں کو علاقہ بدر کر دیا جائے۔

اِس وقت جو قانون نافذ ہے، اِن میں سے کوئی بات بھی اُس میں ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ وہ مجرد شہادت پر سزا دیتا ہے، اُس میں انکار یا اقرار کو بھی وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا آیت تقاضا کرتی ہے، سرکشی اور اصرار بھی ضروری نہیں ہے، دعوت وتبلیغ اور اِس کے نتیجے میں توبہ اور اصلاح کی بھی گنجایش نہیں ہے، اُس کی رو سے قتل کے سوا کوئی دوسری سزا بھی نہیں دی جاسکتی۔ علما اگر آیت محاربہ کو قانون کا ماخذ مان کر اُس کے مطابق ترمیم کے لیے راضی ہو جائیں تو اِس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ اِس کے



Marfat.com

نتیجے میں وہ تمام اعتراضات ختم ہو جائیں گے جو اِس وقت اِس قانون پر کیے جا رہے ہیں۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ موت کی سزا کسی شخص کو دو ہی صورتوں میں دی جا سکتی ہے: ایک یہ کہ وہ کسی کو قتل کر دے، دوسرے یہ کہ ملک میں فساد برپا کرے اور لوگوں کی جان، مال اور آبرو کے لیے خطرہ بن جائے۔ آیت محاربہ کے مطابق ترمیم کر دی جائے تو قرآن کا یہ تقاضا پورا ہو جائے گا۔ پھر یہی نہیں، قانون بڑی حد تک اُس نقطۂ نظر کے قریب بھی ہو جائے گا جو فقہ اسلامی کے جلیل القدر امام ابو حنیفہ اور جلیل القدر محدث امام بخاری نے اختیار فرمایا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی نقطۂ نظر اِس معاملے میں قرین صواب ہے۔ ریاست پاکستان میں احناف کی اکثریت ہے، لیکن باعث تعجب ہے کہ قانون سازی کے موقع پر اُن کی رائے یکسر نظر انداز کر دی گئی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ قانون قرآن کے بھی خلاف ہے، حدیث کے بھی خلاف ہے اور فقہاے احناف کی رائے کے بھی خلاف ہے۔ اِسے لازماً تبدیل ہونا چاہیے۔ یہ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا باعث بن رہا ہے۔

[۲]

توہین رسالت کی سزا کے جو واقعات بالعموم نقل کیے جاتے ہیں، اُن کی حقیقت بھی سمجھ لینی چاہیے۔ ابورافع اُن لوگوں میں سے تھا جو غزوۂ خندق میں قبائل کو مدینہ پر چڑھالانے کے مجرم تھے۔ ابن اسحاق کے الفاظ میں، 'فیمن حزب الأحزاب علی



Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'۔ کعب بن اشرف کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد اُس نے مکہ جا کر قریش کے مقتولین کے مرثیے کہے جن میں انتقام کی ترغیب تھی، مسلمان عورتوں کا نام لے کر تشبیب لکھی اور مسلمانوں کو اذیت پہنچائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں رہتے ہوئے آپ کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ بعض روایتوں کے مطابق آپ کو دھوکے سے قتل کر دینا چاہا۔ عبداللہ بن خطل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کی تحصیل کے لیے بھیجا۔ اُس کے ساتھ ایک انصاری اور ایک مسلمان خادم بھی تھا۔ راستے میں حکم عدولی پر اُس نے خادم کو قتل کر دیا اور مرتد ہو کر مکہ بھاگ گیا*۔ پھر یہی نہیں، یہ تینوں خدا کے رسول کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود آپ کی تکذیب پر مصر رہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون قرآن میں جگہ جگہ بیان فرمایا ہے کہ رسولوں کے براہ راست مخاطبین عذاب کی زد میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ معاندت پر اتر آئیں تو قتل بھی کیے جا سکتے ہیں۔

اِس سے واضح ہے کہ یہ محض توہین کے مجرم نہیں تھے، بلکہ اِن سب جرائم کے مرتکب بھی ہوئے تھے۔ لہٰذا اِنھی کی پاداش میں قتل کیے گئے۔ عبداللہ بن خطل ایک خونی مجرم تھا۔ اُس کے بارے میں اِسی بنا پر حکم دیا گیا کہ کعبے کے پردوں میں بھی چھپا ہوا ہو تو اُسے قتل کر دیا جائے۔

---

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۲۸، ۴/ ۴۴ - ۴۷۔ سیرت النبی، شبلی نعمانی ۱/ ۳۵۲۔



Marfat.com

اِسی طرح کے مجرم تھے جن کا ذکر سورۂ احزاب میں ہوا ہے۔ خدا کے پیغمبر سے مسلمانوں کو برگشتہ اور بدگمان کرنے اور اسلام اور مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ بالکل برباد کردینے کے لیے یہ اُن کی خانگی زندگی کے بارے میں افسانے تراشتے، بہتان لگاتے اور اسکینڈل پیدا کرتے تھے، ازواج مطہرات سے نکاح کے ارمان ظاہر کرتے تھے، مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلانے اور اُن کے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح کی افواہیں اڑاتے تھے، مسلمان عورتیں جب رات کی تاریکی میں یا صبح منہ اندھیرے رفع حاجت کے لیے نکلتی تھیں تو اُن کے درپے آزار ہوتے اور اِس پر گرفت کی جاتی تو اِس طرح کے بہانے تراش کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے تھے کہ ہم نے تو فلاں اور فلاں کی لونڈی سمجھ کر اُن سے فلاں بات معلوم کرنا چاہی تھی۔ اِن کے بارے میں یہ سب چیزیں قرآن کے اشارات سے بھی واضح ہیں اور روایتوں میں بھی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں*۔ چنانچہ فرمایا کہ مسلمان عورتیں اپنی کوئی چادر اوپر ڈال کر باہر نکلیں تاکہ لونڈیوں سے الگ پہچانی جائیں اور اُن کو ستانے کے لیے یہ اِس طرح کے بہانے نہ تراش سکیں۔ نیز فرمایا کہ یہ اشرار بھی متنبہ ہو جائیں کہ اِن حرکتوں سے باز نہ آئے تو عبرت ناک طریقے سے قتل کردیے جائیں گے:

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ ''یہ منافق اگر (اِس کے بعد بھی)

---

* جامع البیان، ابن جریر الطبری ۱۰/۳۳۲۔ تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۳/۵۱۸۔ الکشاف، زمخشری ۳/۵۶۹۔



Marfat.com

فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ لَنُغۡرِیَنَّكَ بِهِمۡ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوۡنَكَ فِیۡهَآ اِلَّا قَلِیۡلًا، مَّلۡعُوۡنِیۡنَ، اَیۡنَمَا ثُقِفُوۡٓا اُخِذُوۡا وَقُتِّلُوۡا تَقۡتِیۡلًا. (۳۳: ۶۰-۶۱)

اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور وہ بھی جن کے دلوں میں بیماری ہے اور وہ بھی جو مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے ہیں تو ہم اِن کے خلاف تمھیں اٹھا کھڑا کریں گے۔ پھر وہ مشکل ہی سے تمھارے ساتھ یہاں رہ سکیں گے۔ اِن پر پھٹکار ہو گی، جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور عبرت ناک طریقے سے قتل کر دیے جائیں گے۔''

اِن کے علاوہ جو واقعات سنائے جاتے ہیں، وہ اگرچہ سند کے لحاظ سے ناقابل التفات ہیں، لیکن بالفرض ہوئے ہوں تو اُن کی نوعیت بھی یہی سمجھنی چاہیے کہ منکرین کے سب وشتم سے اُن کی معاندت پوری طرح ظاہر ہو جانے کے بعد رسولوں کی تکذیب کا وہ قانون اُن پر نافذ کر دیا گیا جو قرآن میں ایک سنت الٰہی کی حیثیت سے مذکور ہے۔ بعض مقتولین کے خون کو ہدر قرار دینے کی وجہ بھی یہی تھی۔ 'لا یقتل مسلم بکافر'* اسی کا بیان ہے۔ علما اِن حقائق سے واقف ہیں، لیکن اِس کے باوجود اُن کا اصرار ہے کہ اِن واقعات سے وہ توہین رسالت کا قانون اخذ کریں گے۔

* بخاری، رقم ۱۱۱۔ ''اِن منکروں کے قصاص میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔''



Marfat.com

یہاں ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اُس قصے سے بھی استدلال کرنا چاہے جو سیدنا عمر کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تسلیم نہ کرنے پر اُنھوں نے ایک شخص کی گردن اڑا دی تھی۔ ہمارے علما یہ واقعہ منبروں پر سناتے اور لوگوں کو بالواسطہ ترغیب دیتے ہیں کہ توہین رسالت کے مرتکبین کے ساتھ وہ بھی یہی سلوک کریں، مگر حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے پہلے، دوسرے، یہاں تک کہ تیسرے درجے کی کتابیں بھی اِس واقعے سے خالی ہیں۔ ابن جریر طبری ہر طرح کی تفسیری روایتیں نقل کر دیتے ہیں، مگر اُنھوں نے بھی اِسے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ ایک غریب اور مرسل روایت ہے جسے بعض مفسرین نے اپنی تفسیروں میں نقل ضرور کیا ہے، لیکن جن لوگوں کو علم حدیث سے کچھ بہرہ حاصل ہے، اُنھوں نے وضاحت کر دی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اِس کی سند بالکل واہی ہے اور ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم کی سندوں میں اِس کا راوی ابن لہیعہ ضعیف ہے*۔ اِس کے بارے میں یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ مفسرین سورۂ نساء (۴) کی آیت ۶۵ کی شان نزول کے طور پر یہی واقعہ بیان کرتے ہیں۔ نساء کی یہ آیت اگرچہ کسی شان نزول کی محتاج نہیں ہے، تاہم جو واقعہ امام بخاری اور دوسرے ائمۂ محدثین نے اِس کی شان نزول کے طور پر بیان کیا ہے اور جسے مفسرین بالعموم نقل کرتے ہیں، وہ اِس کے برخلاف یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر کا ایک انصاری سے پانی پر اختلاف ہو گیا۔

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۱/۶۸۱۔



Marfat.com

معاملہ حضور کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ زبیر اپنے کھیت کو سیراب کر کے باقی پانی اُس کے لیے چھوڑ دیں گے۔ اِس پر انصاری نے فوراً کہا: یارسول اللہ، اِس لیے نا کہ زبیر آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں؟ یہ صریح بے انصافی اور اقربا پروری کا اتہام اور انتہائی گستاخی کی بات تھی۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، مگر آپ نے اِس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنی بات مزید وضاحت کے ساتھ دہرادی اور فرمایا کہ کھیت کی منڈیر تک پانی روک کر باقی اُس کے لیے چھوڑ دیا جائے*۔

علما کو حسن انتخاب کی داد دینی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عفوو درگذر اور رأفت ورحمت کی یہ روایت تو اُنھوں نے نظر انداز کر دی ہے، دراں حالیکہ یہ بخاری و مسلم میں مذکور ہے اور حضرت عمر کے گردن مار دینے کی ضعیف اور نا قابل التفات روایت ہر جگہ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ سنا رہے ہیں۔

[۳]

توہین رسالت کی سزا کے بارے میں جمہور فقہا کی رائے کیا خاص اِس سزا سے متعلق قرآن وحدیث کے کسی حکم پر مبنی ہے؟ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ مسلمانوں کے لیے اِس کی بنا ارتداد اور ذمیوں کے لیے نقض عہد پر قائم کی گئی ہے۔ فقہا یہ کہتے ہیں کہ مسلمان اگر توہین رسالت کا ارتکاب کرے گا تو مرتد ہو جائے گا اور

---

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۶۸۰/۱۔



Marfat.com

مرتد کی سزا قتل ہے۔ اِسی طرح غیر مسلم ذمی اِس کا مرتکب ہوگا تو اُس کے لیے عقد ذمہ کی امان ختم ہو جائے گی اور اِس کے نتیجے میں اُسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ اِس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۲۹ میں غیر مسلم اہل کتاب کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے محکوم اور زیر دست بن کر رہنے کے لیے تیار نہ ہوں تو اُنھیں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اگر کوئی ذمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سب و شتم کا رویہ اختیار کرتا ہے تو اِس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ سرکشی پر اتر آیا ہے اور محکوم اور زیر دست بن کر رہنے کے لیے تیار نہیں ہے*۔ فقہ اسلامی میں اِس استدلال کی ابتدا غالباً عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی اِس رائے سے ہوئی ہے، اُن کا ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| أيما مسلم سب الله ورسوله أو سب أحدًا من الأنبياء، فقد كذب برسول الله صلى الله عليه وسلم، وهي ردة يستتاب، فإن رجع وإلا قتل، وأيما معاهد عاند فسب الله أو سب أحدًا من الأنبياء وجهر به، فقد نقض العهد | ”جو مسلمان اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یا نبیوں میں سے کسی دوسرے نبی پر سب و شتم کرے گا، وہ رسول اللہ کی تکذیب کا مرتکب ہوگا۔ یہ ارتداد ہے جس پر اُس سے توبہ کا تقاضا کیا جائے گا۔ اگر رجوع کر لیتا ہے تو چھوڑ دیا جائے گا اور نہیں کرتا تو قتل کر دیا جائے گا۔ اِسی |

* اِس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: المحلیٰ، ابن حزم ۲۳۴/۱۳۔



Marfat.com

فاقتلوہ.

(زادالمعاد، ابن قیم ۴/۳۷۹)

طرح غیر مسلم معاہدین میں سے کوئی شخص اگر معاند ہو کر اللہ یا اللہ کے کسی پیغمبر پر علانیہ سب وشتم کرتا ہے تو عہد ذمہ کو توڑنے کا مجرم ہو گا، تم اُسے بھی قتل کر دو گے۔''

فقہا کے نزدیک سزا کی بنیاد یہی ہے، لیکن قرآن وحدیث پر تدبر سے واضح ہو جاتا ہے کہ دور صحابہ کے بعد یہ بنیاد ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔ ہم نے اپنی کتابوں، ''میزان'' اور ''برہان'' میں پوری طرح مبرہن کر دیا ہے کہ ارتداد کی سزا اُنھی لوگوں کے ساتھ خاص تھی جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست اتمام حجت کیا اور آپ پر ایمان لانے کے بعد وہ کفر کی طرف پلٹ گئے۔ اُن کے بارے میں خدا کا فیصلہ یہی تھا کہ اگر کفر پر قائم رہیں گے تو اُس کی سزا بھی موت ہے اور ایمان لے آنے کے بعد دوبارہ کفر اختیار کریں گے تو اُس کی سزا بھی موت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ 'من بدل دینه فاقتلوہ'* (جو شخص اپنا دین تبدیل کرے، اُسے قتل کر دو) اُنھی سے متعلق ہے۔ اُن کے لیے یہ سزا اُس سنت الٰہی کے مطابق مقرر کی گئی تھی جو قرآن میں رسولوں کے براہ راست مخاطبین سے متعلق بیان ہوئی ہے۔ زمانۂ رسالت کے بعد پیدا ہونے والے مسلمانوں سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

---

* بخاری، رقم ۳۰۱۷۔



Marfat.com

نقض عہد کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اب دنیا میں نہ کوئی ذمی ہے، نہ کسی کو ذمی بنایا جا سکتا ہے۔ سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۱۲۹ اتمام حجت کے اُسی قانون کی فرع ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ چنانچہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اِس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے اُنھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اِس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے*۔ مسلمان ریاستوں کے غیر مسلم شہری نہ اصلاً مباح الدم ہیں، نہ ذمی ہیں اور نہ کسی امان کے تحت رہ رہے ہیں جس کے اُٹھ جانے کی صورت میں اُن کے بارے میں قتل کا حکم دیا جائے۔ یہ سب چیزیں اب قصۂ ماضی ہیں۔ اِنھیں کسی لحاظ سے بھی بنائے استدلال نہیں بنایا جا سکتا۔

اِس کے بعد دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں: ایک یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کو سامنے رکھ کر قانون سازی کی جائے اور تعزیر کے طور پر کوئی سزا مقرر کر دی جائے۔ دوسرے یہ کہ سورۂ مائدہ (۵) کی آیات ۳۳-۳۴ کو قانون سازی کی بنیاد بنایا جائے۔ یہی دوسری صورت ہے جس کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ مائدہ کی اِن آیتوں کو بنیاد بنا کر قانون سازی کی جائے گی تو یہ تین چیزیں لازماً ملحوظ رکھنا ہوں گی،

---

* اِس کے دلائل کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' میں ''قانون جہاد'' کے زیر عنوان کر دی ہے۔



Marfat.com

قرآن کے الفاظ اِس کا تقاضا کرتے ہیں:

۱۔ توہین کے مرتکب کو توبہ واصلاح کی دعوت دی جائے گی اور بار بار توجہ دلائی جائے گی کہ وہ خدا اور رسول کا ماننے والا ہے تو اپنی عاقبت برباد نہ کرے اور اُن کے سامنے سرِتسلیم خم کر دے اور ماننے والا نہیں ہے تو مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرے اور اِس جرمِ شنیع سے باز آ جائے۔

۲۔ اُس کے خلاف مقدمہ صرف اُس صورت میں قائم کیا جائے گا، جب وہ توبہ اور رجوع سے انکار کر دے؛ سرکشی کے ساتھ توہین پر اصرار کرے؛ فساد انگیزی پر اتر آئے؛ دعوت، تبلیغ، تلقین و نصیحت اور بار بار کی تنبیہ کے باوجود باز نہ آئے، بلکہ مقابلے کے لیے کھڑا ہو جائے۔

۳۔ سزا میں گنجایش رکھی جائے گی کہ جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات تقاضا کرتے ہوں تو قتل جیسی انتہائی سزا کے بجائے اُسے کوئی کم تر سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

[۲۰۱۱ء]

# قتل عمد کی سزا

مذہب و اخلاق کی رو سے انسانی جان کو ہمیشہ حرمت حاصل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ



Marfat.com

نے اپنی کتاب میں پوری صراحت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ کوئی شخص کسی کو قتل نہ کرے، یہ شرک کے بعد سب سے بڑا جرم ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل کو یہی حکم اِس تاکید کے ساتھ دیا گیا تھا کہ ایک انسان کا قتل درحقیقت پوری انسانیت کا قتل ہے۔ تالمود میں یہ فرمان کم و بیش اِنھی الفاظ میں آج بھی موجود ہے۔ سورۂ مائدہ میں قرآن نے اِسی کا حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا. (۵:۳۲)

”(انسان کی) یہی (سرکشی) ہے جس کی وجہ سے ہم نے (موسیٰ کو شریعت دی تو اُس میں) بنی اسرائیل پر بھی فرض کر دیا کہ جس نے کسی ایک انسان کو قتل کیا، اِس کے بغیر کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔“

اِس فرمان سے واضح ہے کہ کسی انسان کی جان دو ہی صورتوں میں لی جا سکتی ہے: ایک یہ کہ وہ کسی کو قتل کر دے، دوسری یہ کہ نظم اجتماعی سے بغاوت کر کے وہ دوسروں کے جان و مال اور آبرو کے درپے ہو جائے۔ زمین میں فساد برپا کرنے کی تعبیر آیت میں اِسی مفہوم کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ اِس کے سوا ہر قتل ایک ناحق قتل ہے جس کا



Marfat.com

ارتکاب اگر کوئی شخص کرتا ہے تو اسلام اور اسلامی شریعت کی رو سے وہ اللہ تعالیٰ کا بھی مجرم ہے، مقتول کے وارثوں کا بھی اور حکومت اور معاشرے کا بھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق بتایا ہے کہ اِس جرم کے مرتکبین اُس کے حضور میں کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں، اُن کا ایمان و عمل، سب اکارت ہوگا اور اُنھیں ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ سورۂ نساء میں ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا. (۴:۹۳)

''اُس شخص کی سزا جہنم ہے جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے، وہ اُس میں ہمیشہ رہے گا، اُس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہے اور اُس کے لیے اُس نے ایک بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

دوسرا فریق مقتول کے وارث ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں قاتل کی جان پر پورا اختیار دے دیا ہے، لہٰذا دنیا کی کوئی عدالت یا حکومت اُن کی مرضی کے بغیر اُس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کر سکتی۔ عدالت اور حکومت، دونوں کی ذمہ داری ہے کہ مقتول کے ورثا اگر قصاص پر اصرار کریں تو اُن کی مدد کریں اور جو کچھ وہ چاہیں، اُسے پوری قوت کے ساتھ اور ٹھیک ٹھیک نافذ کر دیں۔ بنی اسرائیل میں فرمایا ہے:



Marfat.com

| | |
|---|---|
| وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِیِّہٖ سُلۡطٰنًا فَلَا یُسۡرِفۡ فِّی الۡقَتۡلِ اِنَّہٗ کَانَ مَنۡصُوۡرًا. (۱۷:۳۳) | ”خدا نے جس جان کو حرمت دی ہے، اُسے ناحق قتل نہ کرو اور (یاد رکھو کہ) جو مظلومانہ قتل کیا جائے، اُس کے ولی کو ہم نے اختیار دے دیا ہے۔ سو وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے، اِس لیے کہ اُس کی مدد کی گئی ہے۔“ |

اِس کے بعد مسلمانوں کا معاشرہ ہے جس کی نمائندگی اُن کی حکومت کرتی ہے۔ اُس کے بارے میں خدا کا حکم ہے کہ مقتول کا قصاص اُس پر فرض ہے۔ چنانچہ وہ پابند ہے کہ اُس کے دائرۂ اختیار میں اگر کوئی شخص قتل کر دیا جائے تو اُس کے قاتل کا سراغ لگائے، اُسے گرفتار کرے اور قانون کے مطابق اُس سے قصاص لے۔ اِس کے لیے اُسے ہدایت کی گئی ہے کہ قصاص میں پوری مساوات ملحوظ رہنی چاہیے اور کسی شخص کا سماجی اور معاشرتی مرتبہ اِس معاملے میں ہرگز کسی ترجیح کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، شریف و وضیع اور آقا و غلام، سب اِس معاملے میں بالکل برابر ہیں، اُن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔

ارشاد فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی اَلۡحُرُّ بِالۡحُرِّ | ”ایمان والو، (تم میں) جو لوگ قتل کر دیے جائیں، اُن کا قصاص تم پر |



Marfat.com

وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ... وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ.

(البقرہ۲:۱۷۸-۱۷۹)

فرض کیا گیا ہے، اِس طرح کہ قاتل آزاد ہو تو اُس کے بدلے میں وہی آزاد، غلام ہو تو اُس کے بدلے میں وہی غلام، عورت ہو تو اُس کے بدلے میں وہی عورت ... اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے، عقل والو، تاکہ تم حدودِ الٰہی کی پابندی کرتے رہو۔"

یہ فرضیت صرف اُس صورت میں ختم ہوتی ہے، جب مقتول کے ورثا جان کے بدلے میں جان کا مطالبہ نہ کریں اور مجرم کے ساتھ نرمی برتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اِس کے بعد عدالت اور حکومت کا اختیار ہے کہ چاہے تو قصاص پر اصرار کرے اور مقتول کے وارثوں کی طرف سے کی گئی رعایت کو قبول کرنے سے انکار کر دے اور چاہے تو جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کے پیشِ نظر یہ رعایت قبول کر لے اور قاتل کو حکم دے کہ وہ مقتول کے وارثوں کو دستور کے مطابق دیت ادا کرے۔ سورۂ بقرہ (۲) کی جو آیت ۱۷۸ اوپر نقل ہوئی ہے، اُسی میں آگے فرمایا ہے:

فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ م بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ

"پھر جس کے لیے اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی جائے



Marfat.com

اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ.

تو دستور کے مطابق اُس کی پیروی کی جائے گی اور جو کچھ بھی خون بہا ہو، وہ خوبی کے ساتھ ادا کر دیا جائے گا۔ یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک قسم کی رعایت اور تم پر اُس کی عنایت ہے۔"

یہ، اگر غور کیجیے تو بالکل اُسی اسلوب میں رخصت کا بیان ہے، جس طرح روزے کی آیتوں میں ہے کہ ایمان والوں پر روزے فرض کیے گئے ہیں، لیکن کوئی مریض یا مسافر ہو تو وہ روزے چھوڑ سکتا ہے۔ اِس صورت میں یہ چھوڑے ہوئے روزے اُسے بعد میں پورے کرنا ہوں گے۔ چنانچہ دیکھیے، وہاں ارشاد ہے کہ "ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں"۔ یہاں فرمایا ہے کہ "ایمان والو، تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے"۔ وہاں ارشاد ہے کہ "پھر جو مریض یا مسافر ہو"۔ یہاں فرمایا ہے کہ "پھر جس کے لیے اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی جائے"۔ وہاں ارشاد ہے کہ "وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرے"۔ یہاں فرمایا ہے کہ "دستور کے مطابق اُس رعایت کی پیروی کی جائے"۔ قرآن کے طلبہ دونوں آیتوں کو بالمقابل رکھ کر دیکھ سکتے ہیں کہ دونوں میں جملوں کی تالیف بالکل ایک ہی ہے اور دونوں میں رعایت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے، اُسے لازم نہیں کیا گیا۔ لہٰذا جس طرح وہاں



Marfat.com

مسلمان پابند نہیں ہو گئے کہ سفر یا مرض کی حالت میں روزہ لازماً چھوڑ دیں، اُسی طرح یہاں بھی حکومت اور معاشرہ جن پر قصاص فرض کیا گیا ہے، ہرگز اِس کے پابند نہیں ہوئے کہ مقتول کے وارثوں نے اگر رعایت کا فیصلہ کیا ہے تو اُسے لازماً قبول کر لیں۔ اُن کی طرف سے رعایت کے بعد قصاص کی فرضیت ختم ہوئی ہے، اُس کا جواز ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ حکومت اور معاشرے کو پورا حق ہے کہ جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کے پیش نظر وہ قصاص ہی پر اصرار کریں اور اِس رعایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔

قرآن کا یہی مدعا ہے جس کے پیش نظر اِن آیتوں کا ترجمہ ''البیان'' میں اِس طرح کیا گیا ہے:

''ایمان والو، (تم میں) جو لوگ قتل کر دیے جائیں، اُن کا قصاص تم پر فرض کیا گیا ہے۔ اِس طرح کہ قاتل آزاد ہو تو اُس کے بدلے میں وہی آزاد، غلام ہو تو اُس کے بدلے میں وہی غلام، عورت ہو تو اُس کے بدلے میں وہی عورت۔ پھر جس کے لیے اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی جائے (تو اُس کو تم قبول کر سکتے ہو، لیکن یہ قبول کر لی جائے) تو دستور کے مطابق اُس کی پیروی کی جائے گی اور جو کچھ بھی خون بہا ہو، وہ خوبی کے ساتھ اُسے ادا کر دیا جائے گا۔ یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک قسم کی رعایت اور تم پر اُس کی عنایت ہے۔ پھر اِس کے بعد جو زیادتی کرے تو اُس کے لیے (قیامت میں) دردناک سزا ہے —



Marfat.com

اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے، عقل والو، تاکہ تم حدود الٰہی کی پابندی کرتے رہو۔'' (البقرہ ۲: ۱۷۸-۱۷۹)

اِس سے واضح ہے کہ قرآن کو اِس بات پر تو یقیناً اصرار ہے کہ وارثوں کی مرضی کے بغیر قاتل کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاسکتی، لیکن اِس بات پر ہرگز اصرار نہیں ہے کہ وہ نرمی برتنے پر تیار ہو جائیں تو اُسے چھوڑنا ضروری ہے۔ یہ فرق نہایت حکیمانہ ہے۔ دوسری بات پر اصرار کیا جائے تو معاشرے کا حق تلف ہوتا ہے اور وہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جس کا ہم ریمنڈ ڈیوس اور شاہ رخ جتوئی کے معاملے میں ماتم کر رہے ہیں اور پہلی بات پر اصرار نہ کیا جائے تو وارثوں کا حق تلف ہوتا ہے اور وہ حکمت باطل ہو جاتی ہے جو اِس پورے قانون میں ملحوظ ہے کہ مقتول کے وارثوں کی آتش انتقام بجھا دی جائے اور اُن کے زخم کا اِس طرح اندمال کیا جائے کہ اگر وہ کوئی نرم رویہ اختیار کریں تو قاتل اور اُس کے خاندان پر یہ اُن کا براہ راست احسان ہو جس سے نہایت مفید نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔

ہمارے فقہا کی غلطی یہ ہے کہ اُنھوں نے اِس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا اور اِس طرح قتل جیسے سنگین جرم کو معاشرے سے بے تعلق کر کے محض قاتل اور مقتول کے اولیا کے مابین ایک قضیہ بنا دیا ہے۔ قصاص اور دیت کا قانون فقہا کی اِسی رائے پر مبنی ہے۔ اِس قانون میں جلد سے جلد ترمیم کر کے اِسے ہر لحاظ سے کتاب الٰہی کے مطابق کر دینا چاہیے۔ ہم اپنے ایمان وعقیدہ کی رو سے قرآن وسنت کے پابند ہیں، اُن کی کسی خاص



Marfat.com

تعبیر کو ماننے کے ہرگز پابند نہیں ہیں۔ علما سے ہماری درخواست ہے کہ وہ بھی اِن معروضات پر غور فرمائیں۔ یہ خدا کے دین کا معاملہ ہے، اِسے ہر طرح کے تعصّبات سے بالاتر ہو کر دیکھنا چاہیے۔

[۲۰۱۳ء]

# زبان کا ایک اسلوب

قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے، اُس کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جب ایک مذکر اور مونث کو جمع کر کے اُن کے لیے کوئی منصوب یا مجرور ضمیر لانا پیش نظر ہو تو وہ جس طرح عام قاعدے کے مطابق مثنیٰ صورت میں آتی ہے، اِسی طرح اگر معنی میں ابہام کا اندیشہ نہ ہو اور مذکر و مونث، دونوں کی طرف ضمیر کے رجوع کے قرائن بالکل واضح ہوں تو واحد مونث بھی آسکتی ہے، بلکہ کلام عرب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس طرح کے مواقع پر یہ بالعموم واحد مونث ہی آتی ہے۔

زبان کا یہ قاعدہ اگرچہ سیبویہ، زمخشری، ابن ہشام اور دوسرے ائمۂ نحو نے بیان نہیں کیا، لیکن اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ زبان کے جو قواعد و اسالیب بھی نحو و اعراب کے علما نے بیان کیے ہیں، وہ اُنھیں کہیں باہر سے نہیں لائے، اُن کا ماخذ کلام عرب اور



Marfat.com

قرآن مجید ہی ہے۔ زبان قواعد سے نہیں، قواعد زبان سے بنتے ہیں۔ کسی بھی زبان کے بولنے والے جو کچھ بولتے، لکھتے ہیں، اُن کی گفتگوؤں اور تحریروں کے تتبع سے اِس زبان کے جاننے والوں کے لیے اسالیب و قواعد اخذ کیے جاتے ہیں اور اخذ قواعد کا یہ عمل کہیں رک نہیں جاتا، ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اہل تحقیق اگلوں کے اخذ کیے ہوئے قواعد پر تنقید کر کے اُن کی غلطیاں واضح کرتے اور اہل زبان کے کلام کے تتبع سے نئے نئے قواعد اور نئے نئے اسالیب دریافت کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی نیا اسلوب یا نیا قاعدہ بیان کیا جاتا ہے، اُس کی دلیل کے طور پر فقط یہ بات کافی سمجھی جاتی ہے کہ اِس کے شواہد اہل زبان کے مستند کلام میں موجود ہیں۔ کتنے اسالیب ہیں جو سیبویہ اور خلیل بن احمد کے ہاں نہیں ملتے، لیکن مبرد، فرا، زمخشری، ابن ہشام اور دوسرے علما نے اُنھیں اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے اور اُن کے دلائل کی بنا پر وہ بعد میں زبان کے مسلمہ اسالیب قرار پائے ہیں۔ دور کیوں جایئے، ماضی قریب میں امام حمید الدین فراہی اور استاذ امام امین احسن اصلاحی نے کتنے ہی نئے اسالیب دریافت کیے ہیں اور اُن کی بنیاد پر قرآن مجید کی بہت سی مشکلات حل کی ہیں۔ اِس لیے کسی نئے قاعدے یا نئے اسلوب کو محض اِس وجہ سے ناقابل اعتنا نہیں ٹھیرایا جا سکتا کہ وہ نحو و اعراب کی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ ہاں، البتہ اصل ماخذ، یعنی اہل زبان کے کلام کی بنیاد پر اُس پر تنقید کی جا سکتی اور اُسے ناقابل قبول قرار دیا جا سکتا ہے۔

زبان کا جو قاعدہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، وہ بھی نحو کی کتابوں میں تو، بے شک



Marfat.com

بیان نہیں ہوا، لیکن قرآن مجید اور کلام عرب میں اِس کے شواہد موجود ہیں۔ ہم چند مثالیں پیش کر کے اُن کی وضاحت کیے دیتے ہیں تاکہ علماے فن اُن پر غور کے بعد اِس قاعدے کی صحت وعدم صحت کے بارے میں کوئی راے قائم کر سکیں۔

لبید بن ربیعہ العامری، اپنے مشہور معلقہ میں اونٹنی کی تشبیہات بیان کرتے ہوے، ایک جنگلی گدھے اور گدھی کا ذکر کرتا ہے جو طویل عرصے تک وادی ثلبوت میں ٹھہرے رہے اور جمادی الاخریٰ کا مہینا گزر جانے کے بعد موسم گرما کے آغاز میں اِس وادی سے نکلے۔ اُس کے اشعار ہیں:

حتی إذا سلخا جمادی ستة　　جزآ فطال صیامه و صیامها

رجعا بأمرهما إلی ذی مرة　　حصد و نجح صریمة إبرامها

ورمی دوابرها السفا و تهیجت　　ریح المصایف سومها و سهامها

''وہ طویل عرصے تک وادی ثلبوت میں مقیم رہے، یہاں تک کہ جب جمادی الاخریٰ کا مہینا بھی اُنھوں نے اِس طرح گزار دیا کہ پانی کے بجاے گھاس ہی پر اکتفا کی اور دونوں ایک عرصے تک چلنے پھرنے سے رکے رہے تو اُنھوں نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے معاملے کے بارے میں فیصلہ کیا ـــــ درحقیقت مقصد تو اُس کے لیے مضبوط عزم ہی سے پورا ہوتا ہے ـــــ اور بُہمی کے کانٹے اُن دونوں کے سموں میں چبھنے لگے اور گرما کی ہوا چلنے لگی اور اُس کی لو تیز ہو گئی۔''

اب دیکھیے، ذکر گدھے اور گدھی کا ہو رہا ہے۔ 'سلخا'، 'جزآ' اور 'رجعا'،



Marfat.com

سب میں ضمیر مرفوع گدھے اور گدھی، دونوں کے لیے اور صیغہ کے اعتبار سے مثنیٰ ہی ہے، لیکن جب پاؤں میں کانٹے چبھنے کا تذکرہ ہوا اور اِس کے لیے ضمیر مجرور لانا پڑی تو 'رمی دوابرھا' میں یہ گدھے اور گدھی، دونوں کے لیے واحد مونث ہی آئی ہے۔ اِن اشعار میں اِس ضمیر کا مرجع آپ کسی مصدر کو قرار دے سکتے ہیں نہ پچھلے جملے میں مذکور کسی بات کے مفہوم کو۔ آپ اِسے صرف گدھی کی طرف بھی نہیں لوٹا سکتے، اِس لیے کہ کانٹے چبھنے کا تذکرہ یہاں جس پہلو سے ہوا ہے، اُس میں سے گدھے کے استثنا کی کوئی صورت بھی شعر کے مفہوم سے آنکھیں بند کیے بغیر نکالنا ممکن نہیں ہے۔

حماسی شاعر عبداللہ بن الزبیر الاسدی کا شعر ہے:

سمعت بكاء باكية و باك　　　أبان الدهر واحدها الفقيدا

''تو (ہند اور رملہ کو ماتم کناں دیکھتا تو) اُس رونے والے اور رونے والی کی آہ وبکا سنتا جن کا اکلوتا بیٹا گم ہو گیا ہو، زمانے نے اُسے اُن سے جدا کر دیا ہو۔''

یہاں بھی دیکھ لیجیے، 'باكية' اور 'باك' کے لیے ضمیر واحد مونث ہی آئی ہے، 'واحدها' کے بجائے 'واحدهما' نہیں آیا۔

قرآن مجید میں ہے:

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ، يَّوْمَ | ''اور جو لوگ سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اپنے اِس سونے اور چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں |



Marfat.com

يُحْمٰى عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ. (التوبہ ۹:۳۴-۳۵)

کرتے، اُن کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ وہ دن جب دوزخ میں اُن کے اِس سونے اور چاندی پر آگ دہکائی جائے گی، پھر اُس سے اُن کی پیشانیاں، اُن کے پہلو اور اُن کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔"

اِس آیت میں سونے اور چاندی، دو چیزوں کا ذکر ہوا ہے، لیکن اِن دونوں کے لیے 'يُنفِقُونَهَا'، 'يُحْمٰى عَلَيْهَا' اور 'فَتُكْوٰى بِهَا' میں جہاں کہیں بھی ضمیر منصوب یا مجرور استعمال کرنے کی ضرورت پڑی ہے، اُسے واحد مونث ہی استعمال کیا گیا ہے۔ زمخشری اور دوسرے ائمۂ تفسیر نے اُس کا مرجع 'ذَهَبٌ وَّفِضَّة' کے معنی مقدر، یعنی دنانیر ودراہم کو قرار دیا ہے، لیکن اُن کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم اِس آیت پر بحث کرکے واضح کر دیتے کہ یہاں یہ ضمیر 'ذَهَبٌ وَّفِضَّة' کے الفاظ کے بجائے اُن کے کسی ہم معنی لفظ یا الفاظ کی طرف لوٹائی جائے تو اِس سے آیت کے معنی کا حسن ہی مجروح نہیں ہوتا، وہ تصویر بھی دھندلا جاتی ہے جو 'يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ، فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَ ظُهُورُهُمْ' کے الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک سورۂ جمعہ کی آیت 'وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ۨانْفَضُّوْا اِلَيْهَا' (اور



Marfat.com

جب کوئی تجارت یا کھیل کی چیز پاتے ہیں تو اُس کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں) میں چونکہ حرف 'اَوْ' تخییر یا 'إثبات أحد المذکورین' کے بجائے تقسیم کے لیے ہے، یعنی اُن میں سے کچھ تجارت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کچھ کھیل تماشے کی طرف، اور اِس میں بھی معطوف اور معطوف علیہ جمع کے حکم ہی میں ہوتے ہیں، اِس لیے ایک مذکر اور ایک مونث میں سے 'لَھْو' یعنی مذکر اگرچہ ضمیر کے قریب واقع ہوا ہے، 'اِلَیْھَا' میں ضمیر مجرور واحد مونث ہی استعمال ہوئی ہے اور ہماری راے میں اِس کا مرجع بھی 'تِجَارَۃ' اور 'لَھْو'، دونوں ہی ہیں۔

[۱۹۸۲ء]

# محمد اور احمد

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد بھی ہے اور محمد بھی۔ قرآن مجید میں ہر جگہ آپ کا ذکر محمد کے نام سے ہوا ہے، لیکن سورۂ صف میں حضرت مسیح کی جو بشارت آپ کے بارے میں نقل ہوئی ہے،[۱] اُس میں آپ کا نام احمد آیا ہے۔ ہمارے نزدیک اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا جو نام آپ کی والدہ محترمہ نے رکھا، وہ احمد ہی ہے۔ ابن سعد میں ہے

---

۱؎ ۶۲:۱۱۔



Marfat.com

کہ زمانۂ حمل میں آپ کی والدہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہونے والے بچے کا نام احمد رکھیں۔ آپ کا نام محمد آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پیدایش کے بعد رکھا۔ حضرت مسیح کی بشارت چونکہ آپ کی نبوت کی ایک قطعی دلیل بھی ہے، اِس وجہ سے اُس میں یہی موزوں ہوا کہ آپ کا ذکر اُس نام سے ہو جو آپ کی والدہ نے رکھا اور جو اِس اعتبار سے آپ کا اصلی نام ہے۔

رہی یہ بات کہ قرآن مجید میں ہر جگہ آپ کا ذکر محمد کے نام سے کیوں ہوا ہے تو اِس کا سبب یہ ہے کہ 'محمد' معنوی اعتبار سے لقب ہے۔ چنانچہ آپ کے شرف و اعزاز کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کا ذکر اِسی سے کیا اور امت میں بھی آپ کا تذکرہ زیادہ تر اِسی نام سے ہوتا ہے۔

[۱۹۸۹ء]



Marfat.com

نقد و نظر

Marfat.com

Marfat.com

# دین اور عقل

ہمارے ہاں لوگ بالعموم کہتے ہیں کہ دین کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو بس مان لینے کی چیز ہے۔ چنانچہ اِس باب میں علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ دین کے احکام اگر عقل پر مبنی ہوتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں کے اوپر مسح کرنے کا حکم نہ دیتے۔ عقل کا تقاضا یہی تھا کہ پاؤں چونکہ زیادہ تر نیچے سے گندے ہوتے ہیں، اِس لیے مسح بھی وہیں کیا جاتا۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید بالصراحت کہتا ہے کہ سارا دین عقل پر مبنی ہے۔ وہ اپنے تمام احکام و عقائد اِسی بنیاد پر انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اُس نے جو بات بھی کہی ہے، اُس کے لیے ہر جگہ عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔ وہ اِن دلائل سے گریز کی راہ اختیار کرنے والوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنی عقل سے کیوں کام نہیں لیتے۔ قرآن مجید کا مطالعہ اگر تدبر کے ساتھ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انسان دین کو ماننے اور اُس کی ہدایات پر عمل کرنے کا مکلّف ہی اِس لیے ٹھیرایا گیا ہے کہ اُس کے پروردگار نے اُسے عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک بھلا چنگا آدمی جس کے کسی



Marfat.com

عضو میں کوئی نقص نہیں ہوتا، محض عقل سے محروم ہو جانے کی وجہ سے دین میں تمام ذمہ داریوں سے بری قرار دیا جاتا ہے۔ وہ باقی ہر لحاظ سے صحیح سالم ہونے کے باوجود قرآن وحدیث کی رو سے نہ روزہ ونماز کا مکلّف ہوتا ہے اور نہ اُسے کسی جرم کے ارتکاب پر سزا دی جاسکتی ہے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ ہماری عقل بہت سے دینی حقائق خود دریافت نہیں کرسکتی، لیکن اللہ کے نبیوں کی طرف سے اُن کی وضاحت کے بعد وہ اُنھیں سمجھنے کی صلاحیت، بے شک رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں ماننے کا تقاضا بھی اللہ تعالیٰ نے اُسی سے کیا ہے۔

آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافت ہماری جامعات میں سائنس کے طلبہ نے دریافت نہیں کیا۔ وہ شاید اُسے دریافت کر بھی نہیں سکتے، لیکن اب وہ ہر روز اُسے سمجھتے اور جس حد تک اپنی عقل کے مطابق پاتے ہیں، بغیر کسی تردد کے مان لیتے ہیں۔ سائنس کا استاد، جب یہ نظریہ اُنھیں سمجھاتا ہے تو اُن کی عقل ہی کو خطاب کرتا ہے اور اُسی سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اِسے مانے۔

دین بھی انسان کی عقل ہی کو خطاب کرتا ہے۔ چنانچہ وہ عقل سے ماورا کوئی ہدایت عقل کو نہیں دیتا۔ اُس کی تمام ہدایات بالکل عقل کے مطابق ہیں۔

ہم نہیں سمجھتے کہ علی رضی اللہ عنہ جیسے عاقل انسان نے مسح کے بارے میں وہ بات کہی ہو گی جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص بادنیٰ تامل سمجھ سکتا ہے کہ جرابوں پر مسح اُن کی غلاظت دور کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا۔ اِس کی حیثیت تیمّم کی



Marfat.com

طرح محض ایک علامت کی ہے جس سے ہم ایک طرح کی ذہنی پاکیزگی حاصل کرتے ہیں۔ہم پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی میں محض پاؤں کے اوپر ہاتھ پھیر لینے سے حاصل ہو جاتی ہے۔اِسے کسی طرح خلاف عقل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

[۱۹۸۸ء]

# علم و تحقیق کا المیہ

اِس معاشرے میں ہر چیز گوارا کی جاتی ہے، لیکن علم و تحقیق کا وجود کسی حال میں گوارا نہیں کیا جاتا۔لوگ بے معنی باتوں پر داد دیتے، خرافات پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے، جہالت کے گلے میں ہار ڈالتے اور حماقت کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں، مگر کسی علمی دریافت اور تحقیقی کارنامے کے لیے، بالخصوص اگر وہ دین سے متعلق ہو تو اُن کے پاس اینٹ پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہاں سب سے بڑا مرض عامیانہ تقلید کا مرض ہے۔ ہر وہ چیز جسے لوگوں نے اختیار کیا ہوا ہے؛ جو پہلے سے چلی آ رہی ہے؛ جس سے لوگوں کے جذبات وابستہ ہیں؛ جو اُن کی شناخت بن گئی ہے؛ جو اُن کے لیے ایک روایت کی حیثیت رکھتی ہے،



Marfat.com

وہ اگرچہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو اور اُس نے حقیقت کا چہرہ کتنا ہی مسخ کیوں نہ کر دیا ہو اور وہ اللہ کے کسی صریح حکم اور اُس کے رسول کی کسی واضح سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، لوگ اُس پر کوئی تنقید سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اُنھیں اِس بات سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی کہ کہنے والے نے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دلیل کیا پیش کی ہے۔ اُن کی ساری تگ و دو کا محور صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اُس روایت کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ وہ تنقید کرنے والے کے دلائل سے گریز کر کے، اُس کے کلام میں تحریف کر کے، اُس کے مدعا کو تبدیل کر کے، اُس کی شخصیت کو مجروح کر کے، اُس کا مذاق اڑا کر، غرض یہ کہ ہر طریقے سے حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اِس معاملے میں سب سے برا رویہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو بس شد بد علم کی بنا پر مذہبی پیشواؤں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو اُن سے زیادہ اُن کے عقائد و نظریات کا محافظ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص اخنس بن شریق کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اصلاً قبیلۂ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا، لیکن اِس بات کا مدعی تھا کہ وہ بنی زہرہ میں سے ہے۔ چنانچہ جاہلی روایات کی حفاظت میں وہ اُن لوگوں سے کہیں زیادہ سرگرم ہوا جو خود اُن روایات کے امین تھے۔

اِس طرح کے لوگ چونکہ احساس کہتری کے مریض اور خود اعتمادی سے محروم



Marfat.com

ہوتے ہیں، اِس وجہ سے دوسرے مذہبی پیشوا اگر کسی رائے کو غلط کہیں تو یہ اُسے گمراہی کہتے ہیں، وہ اُسے گمراہی قرار دیں تو یہ اُسے فتنہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں اِس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ وہ جہاں جاتے، جو کچھ پڑھتے اور جس سے ملتے ہیں، اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے کچھ مسالہ تلاش کرنے اور اپنی سیادت کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈنے کے سوا اُنھیں کسی چیز سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ وہ بحث میں بھی علمی محاکمے کا طریقہ اختیار نہیں کرتے، بلکہ اپنا سارا زور لینا، پکڑنا، جانے نہ دینا کی قسم کے نعرے بلند کر کے مذہبی پیشواؤں کو اِس بات کی طرف متوجہ کرنے پر صرف کرتے ہیں کہ علم و تحقیق کی ہر شمع جس قدر جلد ممکن ہو، بجھا دی جائے۔ وہ اگر زندگی کے کسی مرحلے میں کبھی کسی ایسے شخص کی صحبت میں چند دن گزار لینے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں جو یوحنا بپتسمہ دینے والے کی طرح اونٹ کے بالوں کا لباس پہنتا، ٹڈیاں اور جنگلی شہد کھاتا اور بادشاہوں کی طرح کلام کرتا ہے تو باقی زندگی اِس تشویش میں گزار دیتے ہیں کہ لوگ کہیں اُنھیں بھی اِس مردِ حر کا ہم نوا نہ سمجھ لیں۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن ایک براءت نامہ شائع کرتے ہیں کہ لوگو، آگاہ رہو۔ میں اگرچہ کبھی مسیح کا ساتھی تھا، لیکن اب تم اُسے صلیب دینا چاہتے ہو تو وہ جو مرغ کے دوبار اذان دینے سے پہلے تین مرتبہ اُس کا انکار کرے گا، وہ میں ہی ہوں۔

اُن کی شخصیت ایک عجیب مجموعۂ تضادات ہوتی ہے۔ وہ اپنے پیرووں کے سامنے بڑی شان کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنھوں نے جو رائے قائم کی ہے، دلیل



Marfat.com

کی بنا پر قائم کی ہے۔ چنانچہ کوئی شخص اگر دلیل سے اُن کی رائے کو غلط ثابت کردے گا تو وہ بغیر کسی تردد کے اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار ہوں گے، لیکن جب کوئی شخص اُن کے نقطۂ نظر کے خلاف برہان قاطع لے کر اُن کے سامنے آجاتا ہے تو بے تکلف فرماتے ہیں: میاں، دلیل کی حیثیت تو بس ایک لونڈی کی ہے جس سے جو خدمت لینا چاہو گے، وہ بجالائے گی۔ اصلی تبدیلی تو دل کی تبدیلی ہے، اور اُس کی بارگاہ میں دلیل کی کیا حیثیت؟ وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بغیر کسی تعصب کے اُن کی بات سنیں، لیکن جب اُن کا کوئی پیرو بغیر کسی تعصب کے دوسرے کی بات سننا چاہتا ہے تو اُن کا غضب لاوے کی طرح ابلتا اور خود اُن کے وجود کی ساری غلاظتوں کو اُن کے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ وہ دوسروں کو درس دیتے ہیں کہ برے گمانوں سے بچو اور کان لگانے اور ٹوہ میں رہنے سے احتراز کرو، لیکن اپنے کسی مخالف کی کردار کشی کے لیے اُنھیں اگر کسی تنکے کا سہارا ملنے کی بھی توقع ہو تو وہ اِس کے لیے ہر پتھر کو الٹنے اور ہر وادی کو قطع کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

لیکن اِس پر شکایت کا کیا محل؟ اِس معاشرے میں جہاں صدیوں سے تحقیق و اجتہاد کی حیثیت ایک شجر ممنوعہ کی رہی ہے؛ جہاں وہ لوگ بھی جو بظاہر اہل دین اور ارباب دانش سمجھے جاتے ہیں، علم کے جواب میں جہالت اور استدلال کے جواب میں ابتذال کی روش اختیار کرتے ہیں؛ جہاں بات کو سننے اور سمجھنے کے بجائے قائل کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے لوگوں کو زیادہ دل چسپی ہوتی ہے؛ جہاں ہر وہ چیز جس پر



Marfat.com

دو چار صدیاں گزر جائیں، مقدس ہو جاتی ہے؛ جہاں صحیح اور غلط کا معیار بالعموم لوگوں میں پذیرائی ہوتا ہے، وہاں اِس سے بہتر کسی رویے کی توقع آخر کی ہی کیوں جائے؟

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی حقیقتیں بالعموم اِسی طرح کے ماحول میں مرسحِ عالم پر نمودار ہوئی ہیں۔ یہ رویے نہ یوحنا و مسیح کی دعوت میں سدراہ بن سکے، نہ ابن حزم اور ابن تیمیہ سے اُن کا مقام چھین سکے، نہ سقراط کی حکمت سے دنیا کو محروم کر سکے، نہ کوپرنیکس اور گلیلیو کی دریافتوں کو چھپانے میں کامیاب ہو سکے۔ علم و تحقیق کی شمع ہمیشہ اِسی طرح روشن رہی ہے اور آنے والے زمانوں میں بھی، اگر اللہ نے چاہا تو اِسی طرح روشن رہے گی۔

[۱۹۸۷ء]

# قرآن کا موضوع

قرآن کے بارے میں یہ بات اُس کا ایک عام قاری بھی بہت آسانی کے ساتھ جان سکتا ہے کہ اُس کا موضوع صرف وہ حقائق ہیں جن کو ماننے اور جن سے پیدا ہونے والے تقاضوں کو پورا کرنے ہی پر انسان کی ابدی فلاح کا انحصار ہے۔ وہ اِنھی حقائق کو انفس و آفاق اور تاریخ کے دلائل سے ثابت کرتا ہے، بنی آدم کو اِنھیں ماننے کی دعوت دیتا ہے، اِن کو جھٹلا دینے کے نتائج سے اُنھیں خبردار کرتا ہے اور اِن سے جو



Marfat.com

تقاضے پیدا ہوتے ہیں، اُن کی شرح و وضاحت کرتا ہے۔ اِن کے علاوہ کسی چیز سے اُسے بحث نہیں ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے وہ عالم طبیعی کے بارے میں بھی اگر کچھ کہتا ہے تو اُس کا بیان کبھی حقیقت کے خلاف نہیں ہوتا، لیکن اِس عالم کے متعلق جو علوم و فنون انسان کی عقل نے دریافت کیے ہیں اور جو وہ آنے والے زمانوں میں دریافت کرے گی، اُنھیں قرآن مجید کبھی زیر بحث نہیں لاتا۔ اِس طرح کی کوئی چیز سرے سے اُس کا موضوع ہی نہیں ہے۔

لیکن اِسے کیا کہیے کہ اِس امت کی تاریخ میں بار ہا لوگ اِس کتاب کو اُس کی اِس اصلی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ اُنھوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ یہ چونکہ اللہ کی کتاب ہے، اِس لیے دنیا کے سارے علوم و فنون اِس میں لامحالہ ہونے چاہییں۔ اِس کے بعد وہ اپنے اِس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے اِس بات کے درپے ہوئے کہ کسی طرح اِن علوم و فنون کے ماخذ اُس کی آیات میں سے ڈھونڈ نکالے جائیں۔ چنانچہ زبان و بیان اور نظم کلام کی ہر دلالت کو نظر انداز کر کے کبھی فلسفۂ یونان کے اوہام اِس سے ثابت کیے گئے، کبھی ایک خاص زمانے کی سائنسی معلومات کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ وہ درحقیقت اِس کی فلاں اور فلاں آیت سے اخذ کی گئی ہیں، کبھی علم طب اور نجوم و فلکیات کے بعض عقائد اِس سے برآمد کیے گئے، اور کبھی انسان کے ایٹم بم بنانے اور چاند پر پہنچنے کا ذکر اِس میں سے نکال کر دکھایا گیا۔



Marfat.com

یہ ساری زحمت لوگوں کو صرف اِس لیے اٹھانا پڑی کہ اُنھوں نے اِس کتاب کے بارے میں بالکل غلط تصور قائم کر لیا۔ وہ اِس بات کو نہیں سمجھے کہ عالم کے پروردگار نے اِس کتاب سے پہلے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ جس طرح یہ کتاب پروردگار کی عنایت ہے، اِسی طرح عقل بھی اُسی کی عنایت ہے۔ چنانچہ جن معاملات میں عقل کی رہنمائی اُس کے لیے کافی ہے، اُن سے اِس کتاب کو کوئی تعلق نہیں اور جن سے یہ کتاب بحث کرتی ہے، اُن میں عقل اگر اپنے وجود ہی سے غافل نہ ہو جائے تو اِس کی رہنمائی سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

یہ صرف قرآن مجید ہی کا معاملہ نہیں ہے، اللہ کے نبی نے اپنے بارے میں بھی یہ حقیقت اپنے ماننے والوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھائی ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کھجوروں میں گابھا دیتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اِس کے بغیر ہی ٹھیک ہے۔ اُنھوں نے اُس سال گابھا نہیں دیا۔ چنانچہ پھل بہت ردی آیا۔ لوگوں نے آپ سے اِس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: تم اِس طرح کے معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ میں تمھیں اللہ کا دین بتانے آیا ہوں، اِس لیے میری طرف صرف اُسی کے لیے رجوع کیا کرو۔*

ہم اگر قرآن مجید سے فی الواقع ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ اُس کی طرف صرف دین کے حقائق و معارف جاننے کے لیے رجوع کریں۔ اپنے سونے

---

* مسلم، رقم ۶۱۲۶ - ۶۱۲۸۔



Marfat.com

کے لیے چار پائی بنانے اور اپنی آواز زہرہ و مریخ تک پہنچانے کے لیے ہمیں اپنی عقل کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اُس نے انسان کو اپنے دائرۂ عمل میں کبھی مایوس نہیں کیا۔

قرآن مجید ہم کو یہ بتانے کے لیے نازل کیا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کی رضا ہم اِس دنیا میں کن چیزوں کو مان کر اور کن چیزوں پر عمل کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اُس کی آیات میں اپنی خواہشوں کا مضمون پڑھنے کے بجاے اپنی خواہشوں کو اُس کی پیروی کے لیے مجبور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات قرآن میں جگہ جگہ واضح کی ہے کہ اُس سے ہدایت حاصل کرنے کی پہلی شرط یہی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص دنیا کے سارے علوم وفنون اِسی ایک کتاب میں دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو، لیکن اُس کی یہ خواہش اِس حقیقت کو نہیں بدل سکتی کہ اِس میں صرف اُس علم کا بیان ہے جو انسان کی ابدی فلاح کے لیے ضروری ہے۔

[۱۹۸۷ء]

# طالبان کا استدلال

دنیا جن خدائی فوج داروں کو طالبان کے نام سے جانتی ہے، پچھلے دس سال میں



Marfat.com

وہ اتنے بے گناہوں کو قتل کر چکے ہیں کہ اب اُن کا شمار بھی آسان نہیں ہے۔ اُن کا اصرار ہے کہ یہ سب وہ خدا کے لیے اور خدا کے احکام کی پیروی میں کر رہے ہیں۔ ملالہ یوسف زئی پر بزدلانہ حملے کے بعد بھی اُنھوں نے اپنا یہی موقف ایک مرتبہ پھر بیان کیا ہے۔ اِس کے لیے وہ قرآن وحدیث کے حوالے دیتے اور زمانۂ رسالت کے بعض واقعات کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں لوگ چونکہ بالعموم دین اور دینی علوم سے واقف نہیں ہیں، اِس لیے اندیشہ ہے کہ اِس طرح کی چیزوں سے متاثر ہوں گے۔ یہ چند حقائق اِسی کے پیش نظر ہم یہاں بیان کر رہے ہیں۔

ا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جہاد اسلام کا حکم ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ اُن کے پاس طاقت ہو تو وہ ظلم وعدوان کے خلاف جنگ کریں۔ قرآن میں اِس کی ہدایت اصلاً فتنہ کے استیصال کے لیے کی گئی ہے۔ اِس کے معنی کسی شخص کو ظلم وجبر کے ساتھ اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'persecution' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ حکم اُن کی انفرادی حیثیت میں نہیں، بلکہ بحیثیت جماعت دیا گیا ہے۔ اِس کی جو آیتیں قرآن میں آئی ہیں، وہ اپنی انفرادی حیثیت میں اُن کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا اِس معاملے میں کسی اقدام کا حق بھی اُن کے نظم اجتماعی کو حاصل ہے۔ اُن کے اندر کا کوئی فرد یا گروہ ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اُن کی طرف سے اِس طرح کے کسی اقدام کا فیصلہ کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ



Marfat.com

مسلمانوں کا حکمران اُن کی سپر ہے، جنگ اُسی کے پیچھے رہ کر کی جاتی ہے*۔ طالبان جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اس قاعدے کی پابندی ہے یا اِس کی صریح خلاف ورزی، اِس کا فیصلہ ہر شخص بادنیٰ تامل کر سکتا ہے۔

۲۔ اسلام جس جہاد کا حکم دیتا ہے، وہ خدا کی راہ میں جنگ ہے، اِس لیے اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے اُن سے انحراف کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی۔ چنانچہ یہ بالکل قطعی ہے کہ جہاد صرف مقاتلین (combatants) سے کیا جاتا ہے۔ اسلام کا قانون یہی ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے حملہ کرے گا تو اُس کا جواب زبان سے دیا جائے گا، لڑنے والوں کی مالی مدد کرے گا تو اُس کو مدد سے روکا جائے گا، لیکن جب تک وہ ہتھیار اٹھا کر لڑنے کے لیے نہیں نکلتا، اُس کی جان نہیں لی جا سکتی۔ یہاں تک کہ عین میدان جنگ میں بھی وہ اگر ہتھیار پھینک دے تو اُسے قیدی بنایا جائے گا، اُس کے بعد اُسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں جہاد کا حکم جس آیت میں دیا گیا ہے، اُس کے الفاظ ہی یہ ہیں کہ ''اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑیں اور اِس میں کوئی زیادتی نہ کرو، اِس لیے کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''** نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے دوران میں عورتوں اور بچوں کے قتل سے

---

* بخاری، رقم ۲۹۵۷۔

** البقرہ ۲: ۱۹۰۔



Marfat.com

منع فرمایا ہے*۔ اِس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اگر جنگ کرنے والوں کے ساتھ نکلے بھی ہوں تو بالعموم مقاتل نہیں ہوتے، زیادہ سے زیادہ لڑنے والوں کا حوصلہ بڑھا سکتے اور زبان سے اُنھیں لڑنے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔

یہ خدا کی شریعت ہے، مگر طالبان کیا کر رہے ہیں؟ مولانا حسن جان، ڈاکٹر سرفراز نعیمی اور ڈاکٹر محمد فاروق خان جیسے اہل علم کبھی طالبان کے خلاف لڑنے کے لیے نہیں نکلے۔ ملالہ یوسف زئی ایک معصوم بچی ہے۔ اُس نے بھی کبھی اُن پر بندوق نہیں اٹھائی۔ اِس کے باوجود اُن کا اصرار ہے کہ یہ سب واجب القتل تھے۔ کیا محض اِس لیے کہ اُن سے اختلاف کی جسارت کر رہے تھے؟ اِس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی عمل داری کسی جگہ قائم ہو تو وہ مجرموں کو سزا دے سکتے ہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ اِس میں عورت اور مرد کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ قرآن بالکل صریح ہے کہ عورت چوری کرے یا مرد، دونوں سزا پائیں گے اور دونوں کی سزا ایک ہی ہے۔ یہی بات زانی اور زانیہ کے بارے میں فرمائی ہے۔ لیکن جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے، وہ طالبان کی عمل داری میں کب تھے اور اسلامی شریعت میں جن جرائم کی سزا قتل مقرر کی گئی ہے، اُنھوں نے اُن میں سے کس جرم کا ارتکاب کیا تھا؟ قرآن پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ موت کی سزا قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ اُن میں سے کون ہے جس نے کسی کو قتل کیا تھا یا کسی کی جان، مال یا آبرو کے درپے ہو کر دنیا

* بخاری، رقم ۳۰۱۵۔ مسلم، رقم ۱۷۴۴۔



Marfat.com

میں فساد برپا کرنے کے لیے نکلا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ طالبان خود اِن جرائم کے مرتکب ہیں اور اپنے اعترافات کی گواہی شب و روز خود اپنے محضر پر ثبت کر رہے ہیں۔

۳۔ شرک، کفر اور ارتداد یقیناً سنگین جرائم ہیں، لیکن اِن کی سزا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نہیں دے سکتا۔ یہ خدا کا حق ہے۔ قیامت میں بھی اِن کی سزا وہی دے گا اور دنیا میں بھی، اگر کبھی چاہے تو وہی دیتا ہے۔ قیامت کا معاملہ اِس وقت موضوعِ بحث نہیں ہے۔ دنیا میں اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں اپنی دینونت کے ظہور کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اُس کی طرف اپنا رسول بھیجتے ہیں۔ یہ رسول اُس قوم پر اتمامِ حجت کرتا ہے، یہاں تک کہ کسی کے پاس خدا کے حضور میں پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ اِس کے بعد خدا کا فیصلہ صادر ہوتا ہے اور جو لوگ اِس طرح اتمامِ حجت کے بعد بھی کفر و شرک پر اصرار کریں، اُنھیں اِسی دنیا میں سزا دی جاتی ہے۔ یہ ایک سنتِ الٰہی ہے جسے قرآن نے اِس طرح بیان فرمایا ہے کہ ”ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آ جاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔*“

یہ سزا بالعموم اُسی طریقے سے دی جاتی ہے، جس طریقے سے قومِ نوح، قومِ ہود، قومِ صالح، قومِ لوط، قومِ شعیب اور بعض دوسری قوموں کو دی گئی۔ لیکن رسول کے ساتھی معتد بہ تعداد میں ہوں اور اپنی قوم سے ہجرت کے بعد اُنھیں کسی جگہ اقتدار بھی حاصل

---

* یونس ۱۰: ۴۷۔



Marfat.com

ہو جائے تو پھر یہ سزا رسول اور اُس کے ساتھیوں کی تلواروں سے دی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہی دوسری صورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ آپ کے منکرین میں سے پہلے معاندین مارے گئے۔ اِس کے بعد عام منکرین کے قتل عام کا حکم دیا گیا۔ اُن کے لیے اِس سزا کا اعلان ۹ ہجری میں حج اکبر کے دن ہوا۔ اِس کا حکم قرآن مجید کی سورۂ توبہ میں اِس طرح آیا ہے کہ ''جب (حج اکبر کے بعد) حرام مہینے گزر جائیں تو اِن مشرکوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو اور (اِس مقصد کے لیے) اِن کو پکڑو، اِن کو گھیرو اور ہر گھات کی جگہ اِن کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اِن کی راہ چھوڑ دو۔''*

یہ خدا کا عذاب تھا جو مشرکین عرب پر نازل کیا گیا۔ اِس طرح کا عذاب جب نازل کیا جاتا ہے تو اُس میں عورتوں اور بچوں کے۔ لیے بھی کوئی استثنا نہیں ہوتا اور وہ بھی اُسی طرح ہلاک کر دیے جاتے ہیں، جس طرح نوح اور ہود اور صالح اور لوط اور شعیب علیہم السلام کی قوموں پر یہ عذاب آیا تو ہلاک کر دیے گئے۔ چنانچہ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ اِس کے لیے جب سرایا بھیجے گئے اور لوگوں نے پوچھا کہ وہاں تو مشرکین کی عورتیں اور بچے بھی ہوں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ بھی اُنھی میں سے ہیں۔** یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں آپ نے حکم دیا تھا کہ

---

* ۹:۵۔

** بخاری، رقم ۳۰۱۲۔ مسلم، رقم ۱۷۴۵۔



Marfat.com

اگر اِس وقت ایمان لے آئیں اور بعد میں کبھی مرتد ہو کر دوبارہ کفر اختیار کر لیں تو اِسی سزا کے مستحق ہوں گے اور اِن کی گردن ماری جائے گی۔*

اتمام حجت کے باوجود اِن لوگوں کی سزا میں ۹ ہجری تک یہ تاخیر اس لیے کی گئی کہ معاند نہیں تھے، لہٰذا توقع تھی کہ شاید توبہ اور اصلاح کی توفیق پائیں اور سزا سے بچ جائیں۔ اِس کے برخلاف جو لوگ انکار کے ساتھ دشمنی اور معاندت پر اتر آئے تھے، اُنھیں یہ مہلت نہیں دی گئی۔ وہ جب ممکن ہوا، قتل کر دیے گئے۔ ابورافع، کعب بن اشرف، عبداللہ بن خطل، اُس کی لونڈیاں اور بدر و احد کے قیدیوں میں سے عقبہ بن ابی معیط، نضر بن الحارث اور ابوعزہ وغیرہ، سب اِسی لیے قتل کیے گئے۔ بعض منکرین کا خون بھی اِسی بنا پر رایگاں قرار دیا گیا۔

یہ خدا کا فیصلہ تھا جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد لازماً نافذ ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اِسی کے بارے میں فرمایا ہے کہ خدا کی اِس سنت میں تم کوئی تبدیلی نہیں دیکھو گے۔** اِس کی نوعیت بالکل وہی ہے جو اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی اور واقعۂ خضر میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اِس کا ہم انسانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم جس طرح کسی غریب کی مدد کے لیے اُس کی اجازت کے بغیر اُس کی کشتی میں شگاف نہیں ڈال سکتے، کسی کے بچے کو نافرمان دیکھ کر اُسے قتل نہیں کر سکتے، اپنے کسی

* بخاری، رقم ۳۰۱۷۔

** بنی اسرائیل ۱۷: ۷۷۔



Marfat.com

خواب کی بنیاد پر ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے بیٹے کے گلے پر چھری نہیں رکھ سکتے، اُسی طرح یہ کام بھی نہیں کر سکتے، الّا یہ کہ وحی آئے اور خدا براہ راست اِس کا حکم دے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اِس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔

اپنے اقدامات کے جواز میں طالبان جو کچھ پیش کر رہے ہیں، وہ اِسی طرح کے واقعات ہیں۔ یہ خدائی معاملات کو اپنے لیے عام کر لینے کی جسارت ہے۔ خدا کی زمین پر اِس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہو سکتا۔ ہر بندۂ مومن کو اِس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

[۲۰۱۲ء]

# قرآن اور اسیران جنگ

اسیران جنگ کے بارے میں قرآن کا جو حکم ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کیا ہے، اُس کا ماخذ سورۂ محمد (۴۷) کی آیت ۴ ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی کا نقطۂ نظر اِس معاملے میں مختلف محسوس ہوتا ہے۔ اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اِس کی تقریر اُنھوں نے جس طرح فرمائی ہے، اُس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ متکلم کا منشا



Marfat.com

یہاں جنگی قیدیوں سے متعلق کوئی قانون بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ اگر کافروں سے جنگ کی نوبت آ جائے تو اُن سے مرعوب نہ ہوں، وہ بالکل بے بنیاد اور بے ثبات ہیں، لہٰذا اچھی طرح خوں ریزی کر کے اُن کے کس بل نکال دیں، پھر بھی بچ جائیں تو اُنھیں بھاگنے نہ دیں، بلکہ قیدی بنائیں اور اِس طرح باندھ لیں کہ اِس کے بعد اگر وہ رہائی پائیں تو مسلمانوں کے احسان مند ہو کر یا اُنھیں فدیہ دے کر ہی رہائی پائیں۔

یہ تفسیر متاثر کرتی ہے۔ سورہ میں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے، وہ رسول کے منکرین ہیں اور اتمام حجت کے بعد عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔ اُن کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اُن کا اچھی طرح قلع قمع کرو، اُنھیں بھاگنے نہ دو، بلکہ مضبوط باندھو اور مرہون احسان بنائے بغیر یا فدیہ لیے بغیر رہا نہ کرو تو بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ کلام ہر لحاظ سے سورہ کے مطالب کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ لیکن تدبر کا فیصلہ یہ نہیں ہے۔ اُس کی نگاہ سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ آیت کے الفاظ اِس تفسیر کو قبول نہیں کرتے۔ یہی بات کہنا مقصود ہوتی تو الفاظ غالباً یہ ہوتے کہ 'فإذا لقيتم الذين كفروا فضرب الرقاب، ثم إذا أثخنتموهم فشد الوثاق'، مگر الفاظ یہ نہیں ہیں، بلکہ یہ ہیں کہ 'حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ'۔ 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں فعل مصدر منصوب کی صورت میں ہے اور 'شُدُّوا الْوَثَاقَ' میں سادہ امر کی صورت میں، جو قرینہ موجود ہو تو ترغیب، تلقین، وجوب، دعوت، یہاں تک کہ محض جواز اور



Marfat.com

اباحت کے لیے بھی آجاتا ہے۔ پھر 'ثُمَّ' کے بجائے 'حَتّٰی' ہے جو غایت امر پر دلالت کرتا ہے۔ یہ تبدیلی اِسی لیے ہے کہ متکلم کے پیش نظر یہاں وہ مضمون نہیں ہے جو 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں ہے۔ لہٰذا گردنیں مارنے کے بعد یہ قیدی پکڑنے کی تلقین نہیں ہے، جس طرح کہ استاذ امام نے سمجھا ہے، بلکہ اُسی حکم کی تکمیل اور اُس سے متعلق ایک تنبیہ ہے جو 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں دیا گیا ہے۔ قیدی اُس زمانے میں من جملہ غنائم تھے۔ اُنھیں پکڑنے کے لیے اہل عرب کی فطری رغبت کے پیش نظر فرمایا ہے کہ یہ کام اُس وقت ہونا چاہیے، جب اِن منکرین حق کو بالکل کچل دیا جائے۔ چنانچہ مدعا یہ نہیں ہے کہ پہلا کام گردنیں مارنا اور دوسرا قیدی بنانا ہے جس میں رو رعایت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ یہ ہے کہ جنگ کی نوبت آجائے تو کرنے کا ایک ہی کام ہے اور وہ 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' ہے، اُس کا حق ادا ہونا چاہیے۔ وہ جب آخری درجے میں ادا ہو جائے، تب قیدی پکڑے جا سکتے ہیں۔ صاحب "تفہیم القرآن" نے اِسی بنا پر آیت کا ترجمہ اِس طرح کیا ہے:

"پس جب اِن کافروں سے تمھاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب تم اِن کو اچھی طرح کچل دو، تب قیدیوں کو مضبوط باندھو۔" (۱۱/۵)

اب آگے دیکھیے، فرمایا ہے: 'فَاِمَّا مَنًّام بَعْدُ، وَ اِمَّا فِدَآءً'۔ یہ دوسرا حکم ہے۔ چنانچہ اسلوب پھر وہی ہو گیا ہے جو 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں ہے۔ اُس کے لیے شرط کا فقرہ 'فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا' ہے اور اِس کے لیے 'فإذا شددتم الوثاق'،



Marfat.com

جسے اِس لیے حذف کر دیا ہے کہ 'شُدُّوا الْوَثَاقَ ' کے الفاظ اُس پر دلالت کر رہے ہیں۔ پہلا حکم اُس صورت سے متعلق ہے، جب کافروں سے مڈبھیڑ ہو اور دوسرا اُس صورت سے، جب اِس طرح کے کسی موقع پر قیدی پکڑے جائیں۔ اِس کی ضرورت اِس وجہ سے پیش آئی ہے کہ 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں جو ترغیب و تحریض ہے، اُس کی بنا پر لوگ قیدیوں کو قتل بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ اُس کے بعد دو ہی صورتیں ہیں: فدیہ لینا ہے یا احسان کرنا ہے۔

'مَنًّا' کے لفظ سے بھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اِس جملے میں کسی زائد معنی کے لیے نہیں آیا، بلکہ محض بلا معاوضہ رہا کر دینے کے مفہوم پر دلالت کے لیے آیا ہے۔ معاوضہ لینے کا حق ہو اور نہ لیا جائے تو اِسے احسان ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ 'تحریر'، 'تسریح' اور 'إطلاق' کے الفاظ اِس کی جگہ نہیں آ سکتے تھے۔ یہ اگر لائے جاتے تو 'مجانا' یا 'دون عوض' یا 'من غیر شيء' یا اِسی مفہوم کے کسی لفظ کا اضافہ ضروری تھا۔ قرآن کے ادا شناس جانتے ہیں کہ یہ اُس کا اسلوب نہیں ہے۔ فدیے کے مقابل میں یہ موزوں ترین لفظ ہے جو بلا معاوضہ چھوڑ دینے کے مفہوم پر دلالت کر سکتا تھا، اِس لیے کہ بلا معاوضہ رہائی جنگی قیدیوں کا حق نہیں ہے کہ اُسے احسان سے تعبیر کیا جائے تو اُس میں کوئی زائد معنی ماننا ضروری ہو جائے۔ وہ بجائے خود احسان ہے۔

پھر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ 'مَنًّا' اور 'فِدَآءً'، دونوں اپنے ہی فعل کے



Marfat.com

مصدر ہیں جو 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' کی طرح فعل کی جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ 'أطلق' یا اِس کے ہم معنی کسی فعل سے حال یا مفعول لہ واقع نہیں ہوئے اور نہ جملہ 'ثم لایکون إطلاقهم إلا' کے انداز کا ہے کہ اُس کی ترجمانی اِن الفاظ میں کی جا سکے کہ ''اُس کے بعد اگر یہ تمھارے ہاتھ سے چھوٹیں تو صرف دو ہی شکلوں سے چھوٹیں: یا تو تمھارے احسان کا قلادہ اپنی گردن میں لے کر یا فدیہ دے کر''۔ اِن کی تالیف یہ ہے: 'فإما تمنون منا، و إما تفدون فداء'۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اِس جملے کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ تم اُن پر احسان دھر کر اُنھیں رہا کرو گے، بلکہ یہی ہوں گے کہ اُن پر احسان کرو گے اور اُنھیں رہا کر دو گے۔ زمخشری نے اِسی مفہوم کو 'أن یمنوا علیهم فیطلقوهم' کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ ''الکشاف'' میں ہے:

و المعنی: التخییر بعد الأسر بین أن یمنوا علیهم فیطلقوهم، و بین أن یفادوهم. (۳۲۰/۴)

''آیت کے معنی یہ ہیں کہ قیدی بنا لینے کے بعد دو ہی صورتیں ہیں: یا اُن پر احسان کیا جائے گا اور رہا کر دیا جائے گا یا رہائی کے عوض میں اُن سے فدیہ لیا جائے گا۔''

آیت کا یہ تجزیہ پیش نظر رہے تو ترجمہ اِس طرح ہوگا:

''پس جب اِن منکرین سے تمھاری مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارنی ہیں، یہاں تک کہ اِنھیں جب اچھی طرح تہ تیغ کر لو، تب قیدی بنا کر باندھو۔ پھر جب باندھ لو تو



Marfat.com

احسان کرنا ہے یا فدیہ لینا ہے۔ (تمھارا یہی معاملہ اِن کے ساتھ رہنا چاہیے) تا آنکہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔''

یعنی مڈبھیڑ ہو تو اصل تقاضا گردنیں مارنے کا ہے۔ تمھارا پروردگار یہی چاہتا ہے کہ مقابلے پر آئیں تو زیادہ سے زیادہ تہ تیغ کیے جائیں۔ قیدی بنانے کا اقدام اُس وقت ہونا چاہیے، جب تہ تیغ کرنے کا حق ادا ہو چکا ہو، لیکن بنالو گے تو قتل نہیں کر سکتے۔ اُس کے بعد قانون یہ ہے کہ فدیہ لیا جائے گا یا بلا معاوضہ رہا کیا جائے گا۔ اِن کے اندر جنگ کا حوصلہ جب تک ختم نہیں ہو جاتا، تمھارے لیے یہی حکم ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا ہے: 'ذٰلِكَ'، تمھیں یہی کرنا ہے۔

اِس روشنی میں دیکھیے تو سارا زور 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' پر ہے۔ اِس کے علاوہ جو کچھ کہا گیا ہے، اِس کی تاکید مزید اور قیدی بنانے کے لیے لوگوں کی مبادرت کو روکنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ 'اِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ، وَ اِمَّا فِدَآءً' کا حکم بھی اِسی مضمون سے متعلق ایک برسر موقع تنبیہ کے لیے آیا ہے۔ تاہم قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ کلام کے اصل رخ کو متاثر کیے بغیر اُس نے اپنا وہ قانون بھی بیان کر دیا ہے جو اسیران جنگ کے معاملے میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ اِس کی مثالیں قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ہیں، جہاں اِسی طریقے سے موقع پیدا ہوا ہے تو شریعت کے احکام بھی بیان ہو گئے ہیں۔

قرآن کا یہ حکم عام ہے، اِس لیے کہ قیدی بنا لینے کے بعد جب رسول کے منکرین



Marfat.com

سے احسان یا فدیے کے سوا کوئی معاملہ نہیں کیا جا سکتا تو دوسروں سے بدرجۂ اولیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اِس کے معنی کیا یہ ہیں کہ اِس حکم میں کوئی استثنا نہیں ہو سکتا؟ علم و عقل کے مسلمات جن مستثنیات کا تقاضا کرتے ہیں، وہ ہر قانون، ہر قاعدے اور ہر حکم میں اُس کی ابتدا ہی سے مضمر ہوتے ہیں۔ زبان و بیان کے اسالیب سے واقف کوئی شخص اُن کا انکار نہیں کر سکتا۔ زمانۂ رسالت میں اللہ و رسول کے ایسے معاندین بھی تھے جو دشمنی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ پھر جنگی قیدیوں میں سنگین جرائم کے مرتکبین بھی ہوتے تھے۔ یہ سب یقیناً مستثنیٰ ہوں گے۔ لہٰذا اِس طرح کے مجرموں کا جرم متعین ہو جائے اور اُس کی پاداش میں اُن کو قتل کیا جائے یا اُس زمانے کی روایت کے مطابق غلام بنا کر فروخت کر دیا جائے، اِس سے قیدیوں کے بارے میں اِس عام قانون پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

رہی یہ بات کہ روایات کیا کہتی ہیں، تو اُن کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے تنہا سیدہ جویریہ کا واقعہ کافی ہے۔ وہ کوئی عام خاتون نہیں ہیں۔ اُنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اُن کا واقعہ اِس لحاظ سے بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اُن کی رہائی کے طفیل کم و بیش سو خاندانوں کے قیدی رہا ہوئے۔ لیکن روایتوں کا حال کیا ہے؟ ملاحظہ فرمائیے:

ایک روایت یہ بتاتی ہے کہ اُنھیں لونڈی بنا کر ثابت بن قیس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ثابت رضی اللہ عنہ سے اُنھوں نے درخواست کی کہ مکاتبت کر لیں۔ وہ راضی ہو



Marfat.com

گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں کہ مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے لیے اُن کی مدد کی جائے۔ حضور نے فرمایا: اگر اِس سے بہتر معاملہ کیا جائے تو قبول کرو گی؟ اُنھوں نے پوچھا: وہ کیا ہوسکتا ہے؟ فرمایا: میں تمھاری طرف سے مکاتبت کی رقم ادا کر کے تم سے نکاح کر لیتا ہوں۔

دوسری یہ بتاتی ہے کہ اِس سے پہلے ہی اُن کے والد پہنچ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی۔ میری شان اِس سے بالاتر ہے۔ آپ اُسے رہا کر دیں۔ آپ نے فرمایا: کیا یہ بہتر نہیں کہ خود بیٹی سے پوچھ لیا جائے؟ والد نے پوچھا تو اُنھوں نے کہا: میں حضور کی خدمت میں رہنا پسند کروں گی۔

تیسری یہ بتاتی ہے کہ اِن میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ وہ قیدی تھیں، اُن کے والد آئے، زر فدیہ ادا کیا اور اُنھیں آزاد کرا لیا۔ اِس کے بعد اُنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں دے دیا۔

یہی معاملہ اُن کے ساتھ دوسرے قیدیوں کی رہائی کا ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اُنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے دار ہو جانے کی وجہ سے رہا کیا اور دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور ہی کے پاس تھے۔ آپ نے اُنھیں سیدہ کا مہر قرار دے کر آزاد کر دیا۔*

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اِس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ تاریخی واقعات

* الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۸/۱۱۶۔



Marfat.com

کے سمجھنے میں اِن روایتوں پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں نے دقت نظر کے ساتھ اِن کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ راویوں کا فہم، اُن کا ذہنی اور سماجی پس منظر اور اُن کے دانستہ یا نادانستہ تصرفات بات کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ دین کے طالب علموں کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ روایتوں سے قرآن کو سمجھنے کے بجائے اُنھیں خود روایتوں کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

[۲۰۱۱ء]

# سیدہ عائشہ کی عمر

عام طور پر مانا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح کے وقت ام المومنین سیدہ عائشہ کی عمر چھ سال تھی۔ یہ نکاح سیدہ خدیجہ کی وفات کے بعد مکہ میں ہوا تھا۔ اُن کی رخصتی اِس کے تین سال بعد مدینہ میں ہوئی۔ حدیث و سیرت کی کتابوں میں اُن کے بارے میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ اِس سلسلہ کی روایات بخاری و مسلم میں بھی ہیں اور حدیث کی بعض دوسری کتابوں میں بھی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ دیہاتی اور قبائلی تمدن کی بعض ضرورتوں کے تحت اس طرح کے نکاح ہوتے رہے ہیں۔ اِس کی مثالیں خود ہمارے معاشرے سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ



Marfat.com

بنیادی اخلاقیات سے جو سماجی رویے وجود میں آتے ہیں، وہ مختلف معاشروں میں اُن کے احوال و تجربات کی بنیاد پر مختلف ہو سکتے ہیں اور اُن میں سے کسی ایک کو معیار بنا کر دوسرے کی اخلاقی حیثیت متعین نہیں کی جا سکتی۔ یہ سب باتیں تسلیم کی جا سکتی ہیں، مگر اِس نکاح کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اِس کے بارے میں جو سوال ہر صاحب نظر کے ذہن میں خلجان پیدا کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ اِس نکاح کی ضرورت کیوں پیش آئی اور جو ضرورت آج تھی، اُسے پورا کرنے کے لیے ایک ایسا اقدام کیوں کیا گیا جس سے وہ کئی سال کے بعد بھی پوری نہیں ہو سکتی تھی؟ اِس طرح کے نکاح ہو جاتے ہیں، اِس کو ماننے میں تامل نہیں ہے، مگر بغیر کسی ضرورت کے اور آج کی ضرورت کو برسوں کے بعد پورا کرنے کے لیے بھی ہو جاتے ہیں، یہ ماننا آسان نہیں ہے۔

سیدہ کے نکاح کی تجویز اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش کی گئی ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ایما سے ہوا۔ سیدہ نے جو کردار آپ کی زندگی میں ادا کیا اور علم و حکمت کا جو خزانہ اُن کی ذات والا صفات سے امت کو حاصل ہوا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ اُنھیں اِسی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص کر لیا جائے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ آپ نے یہ نکاح اپنی دعوت کی مصلحت سے کیا۔ سیدہ کے والد آپ کے شب و روز کے ساتھی تھے۔ قبائلی زندگی میں رشتے ناتے تعلقات کی مضبوطی میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ نے مناسب سمجھا کہ اپنے ایک رفیق خاص کے ساتھ یہ رشتہ بھی قائم کر لیا جائے تا کہ



Marfat.com

دوستی اور محبت کا تعلق مضبوط تر ہو جائے۔

اِسی طرح نکاح کی تجویز اگر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے پیش کی گئی ہوتی تو کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے لیے، اپنی بیٹی اور اپنے خاندان کے لیے اِس شرف و اعزاز کے متمنی تھے کہ جس ہستی کو وہ خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، اُس کے ساتھ اُنھیں صہری تعلق کی نسبت بھی حاصل ہو جائے۔ سیدہ اسما کی شادی کے موقع پر اُن کا دھیان اِس طرف نہیں گیا۔ اُن کے بعد یہی ایک بیٹی تھی جس کے ذریعے سے وہ یہ شرف و اعزاز حاصل کر سکتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے نکاح کی تجویز پیش کی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عزیز دوست کی دل داری کے خیال سے قبول کر لیا۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ اِن میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ سیدہ کے بارے میں اگر کسی رؤیا کی بنا پر اِس طرح کا کوئی خیال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں رہا بھی ہو تو آپ نے ہرگز اِس کا اظہار نہیں کیا۔ حدیث و سیرت کا ذخیرہ آپ کی طرف سے اِس نوعیت کے کسی ایما، اشارے یا تجویز سے بالکل خالی ہے۔ صدیق رضی اللہ عنہ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تعلق قائم کرنا چاہتے تو سیدہ کا رشتہ مطعم بن عدی کے بیٹے سے کیوں طے کرتے؟ روایتیں بتاتی ہیں کہ اِس تجویز سے پہلے وہ یہ کر چکے تھے۔ پھر یہی نہیں، اُن کے بارے میں تو بیان کیا گیا ہے کہ جب یہ تجویز اُن کے سامنے آئی تو اُنھیں تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے بچوں کے لیے چچا کی طرح ہیں، اِس رشتے کے ساتھ نکاح کی تجویز کس طرح



Marfat.com

پیش کی جا سکتی ہے؟ اُن کے الفاظ ہیں: 'هل تصلح له ، إنما هي إبنة أخيه*' (کیا وہ اُن کے لیے جائز ہے؟ وہ تو اُن کے بھائی کی بیٹی ہے)۔

روایات بالکل واضح ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیدہ کے نکاح کی تجویز ایک صحابیہ حضرت خولہ بنت حکیم نے پیش کی۔ اُنھی نے آپ کو توجہ دلائی کہ سیدہ خدیجہ کی رفاقت سے محرومی کے بعد آپ کی ضرورت ہے کہ آپ شادی کر لیں، 'یا رسول اللّٰہ ، کأني أراك قد دخلتك خلة لفقد خديجة... أفلا أخطب عليك**؟' آپ کے پوچھنے پر اُنھی نے آپ کو بتایا کہ آپ چاہیں تو کنواری بھی ہے اور شوہر دیدہ بھی۔ آپ نے پوچھا کہ کنواری کون ہے؟ تو اُنھی نے وضاحت کی کہ کنواری سے اُن کی مراد عائشہ بنت ابی بکر ہیں***۔ بیوی کی ضرورت زن و شو کے تعلق کے لیے ہو سکتی ہے، دوستی اور رفاقت کے لیے ہو سکتی ہے، بچوں کی نگہداشت اور گھر بار کے معاملات کو دیکھنے کے لیے ہو سکتی ہے۔ یہ تجویز اگر بقائمی ہوش و حواس پیش کی گئی تھی تو سوال یہ ہے کہ چھ سال کی ایک بچی اِن میں سے کون سی ضرورت پوری کر سکتی تھی؟ کیا اُس سے زن و شو کا تعلق قائم کیا جا سکتا تھا؟ کیا اُس سے بیوی کی رفاقت میسر ہو سکتی تھی؟ کیا وہ بچوں کی نگہداشت کر سکتی تھی؟ کیا گھر بار کے معاملات سنبھال سکتی تھی؟ سیدہ کی عمر سے

* احمد، رقم ۲۵۲۴۱۔

** الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۸/۵۷۔

*** احمد، رقم ۲۵۲۴۱۔



Marfat.com

متعلق روایتوں کے بارے میں فیصلے کے لیے یہ قرائن میں سے ایک قرینہ نہیں، بلکہ بنیادی سوال ہے۔ کیا عقل باور کر سکتی ہے کہ جو ضرورت آج ہے، اُس کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسی تجویز پیش کی جائے جس کے نتیجے میں وہ برسوں کے بعد بھی پوری نہیں ہو سکتی؟ ابن خلدون نے بالکل درست لکھا ہے کہ تاریخی واقعات کی روایت میں اصلی اہمیت امکان وقوع کی ہے۔ یہ محض اِس بنیاد پر قبول نہیں کیے جا سکتے کہ ان کی سند میں فلاں اور فلاں ہے اور یہ متعدد طریقوں سے نقل کیے گئے ہیں۔*

اِس وقت جو اہل علم اِس موضوع پر داد تحقیق دے رہے ہیں، اُنھیں سب سے پہلے اِس سوال کا جواب دینا چاہیے۔ اُنھیں بتانا چاہیے کہ روایت کا یہ داخلی تضاد کس طرح دور کیا جائے گا؟ اور اگر دور نہیں کیا جا سکتا تو علم و عقل یہ تقاضا کیوں نہیں کرتے کہ چھ سال کی عمر میں نکاح کی روایت کو محل نظر ٹھیرایا جائے اور اُن اہل علم کی راے پر بھی غور کر لیا جائے جو یہ کہتے ہیں کہ 'بنت ست' کے بعد 'بعد العشر' کا مفہوم سیدہ کی گفتگو میں مقدر تھا جسے راویوں نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی؟ اِس سوال سے تعرض کیے بغیر جو تحقیق بھی پیش کی جائے گی، وہ کسی صاحب نظر کے لیے ہرگز لائق التفات نہیں ہو سکتی۔

[۲۰۱۲ء]

---

* مقدمہ ابن خلدون ۳۷۔



Marfat.com

# ہماری تعلیم

[۱]

اِس ملک کا تعلیمی نظام دو بڑے حصوں میں بٹا ہوا ہے: ایک دینی مدارس، دوسرے دنیوی تعلیم کی درس گاہیں۔ پہلے دینی مدارس کو لیجیے۔ اِن کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ تقلید کے اصول پر قائم ہوئے ہیں۔ اِن میں یہ بات پہلے دن سے طے کر دی جاتی ہے کہ حنفی ہمیشہ حنفی رہے گا اور اہل حدیث کو ہر حال میں اہل حدیث ہی رہنا ہے۔ اپنے دائرے سے باہر کے اہل علم کی کسی تحقیق اور راے کے بارے میں یہ تصور بھی اِن کے ہاں ممنوعات میں سے ہے کہ وہ صحیح ہو سکتی ہے۔ مذہب ابوحنیفہ کا کوئی پیرو ائمۂ محدثین کے کسی مسلک کو، اور ائمۂ محدثین کے طریقے پر عمل کرنے والا کوئی شخص مذہب ابوحنیفہ کے کسی نقطۂ نظر کو کبھی ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہر جماعت مصر ہے کہ اُس کا مذہب ہر اعتبار سے اوفق بالقرآن والسنہ ہے اور اُس پر اب کسی نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی شخص اِن مدارس میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اُس کے اکابر کی کوئی راے اور تحقیق بھی کسی مسئلے کے بارے میں غلط ہو سکتی ہے۔

اِس اصول پر اِن مدارس سے پڑھ کر نکلنے والوں کی ''استقامت'' سے جو بگاڑ



Marfat.com

ہمارے معاشرے میں پیدا ہوا ہے، وہ کسی صاحب نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ ہم صبح و شام دیکھتے ہیں کہ فرقہ بندی کا ناسور اِس ملت کے جسم میں جاری اور اختلاف ہمیشہ اتفاق پر بھاری رہتا ہے۔ منبر ہمہ وقت غضب سے کانپتا اور محراب ہمیشہ ترش ابرو ہوتی ہے۔ مسجدوں کے حدود ملکوں کی سرحدیں بن گئے ہیں اور اُن میں رہنے والے ایک دوسرے سے کوئی تعلق قائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فقہی تعصّبات دین کی عصبیت پر غالب آ گئے ہیں اور یہ لوگ اُن کی حفاظت کے لیے اب بغیر کسی تردد کے ہر باطل کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ فقہ اسلامی کی تدوین اور اِس ملک میں اُس کے نفاذ کی ہر کوشش بالعموم اِنھی تعصّبات کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ اِس طرح کے مواقع پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض مکاتب فکر نہیں، اقوام و ملل ہیں جو اپنے اپنے مفادات کی حمایت میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئی ہیں۔ یہ بگاڑ اِس زمانے میں جب نفاذ دین کی باتیں کچھ زیادہ ہونے لگی ہیں، بہت نمایاں ہو گیا ہے۔

اِن میں سے جو کچھ وسعت نظر کے مدعی ہیں، اُن کا حال بھی یہ ہے کہ اگر شخص واحد کی تقلید پر اصرار نہیں کرتے تو اِس بات پر، بہر حال مصر ہیں کہ قرآن و سنت پر براہ راست غور و تدبر کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بند ہو چکا ہے۔ اُن کے نزدیک اب قیامت تک کسی شخص کو اِسے کھولنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔ علم اُن کی راے میں جمع اقوال کا نام ہے اور تحقیق یہ اِسے ہی کہتے ہیں کہ کسی مدعا کو ثابت کرنے کے لیے اگلوں میں سے دس بیس کی آرا بطور حوالہ نقل کر دی جائیں۔ کسی آیت کی تاویل اور کسی



Marfat.com

حدیث کی شرح میں کوئی نئی تحقیق، اگر کوئی شخص پیش کر دے تو اُسے مردود قرار دینے میں یہ لمحے بھر کا توقف بھی گوارا نہیں کرتے۔ بڑی سے بڑی غلطی پر بھی یہ محض اس وجہ سے مصر ہو جاتے ہیں کہ پہلوں میں سے کسی کو اِس سے اختلاف نہیں رہا۔ یہ چیز اِن کے ہاں کوئی معمولی اہمیت نہیں رکھتی، یہ اِسے ایمان و عقیدہ کے طور پر اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اپنے اِس نقطۂ نظر کے جو دلائل یہ حضرات بالعموم پیش فرماتے ہیں، وہ عقل و نقل، دونوں کی رو سے بالکل بے بنیاد ہیں۔ اِن میں سے ہر شخص اِس حقیقت سے واقف ہے کہ اِس دین کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے۔ قرآن کے بارے میں یہ بات محتاج بیان نہیں کہ یہ جس طرح اگلوں کے پاس تھا، بالکل اُسی صورت میں ہمارے پاس بھی موجود ہے۔ اُس کے کسی حرف اور کسی شوشے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اُس کی زبان عربی مبین ہے۔ اُس کے الفاظ و اسالیب کے معنی کی تحقیق کے لیے تمام ضروری مواد اِس زمانے میں بھی اُسی طرح میسر ہے، جس طرح اِس امت کے پہلے دور میں تھا۔ قرآن مجید کے بعد دوسرا ماخذ حدیث و سنت ہے۔ اِس کا بیش تر حصہ تواتر عملی کے ذریعے سے ہمیں ملا ہے۔ باقی جو کچھ اخبار آحاد کی صورت میں تھا، اُس میں جتنا کچھ ہمارے اسلاف نے قابل اعتماد پایا، وہ سب اُنھوں نے ہمیں منتقل کر دیا ہے۔ اُس میں سے کوئی چیز بھی اُنھوں نے چھپا کر نہیں رکھی۔ جو کچھ اُنھوں نے چھوڑا اور جو کچھ اختیار کیا ہے، اِس کے وجوہ بھی اُنھوں نے بیان کر دیے ہیں۔ دین میں یہی دو



Marfat.com

چیزیں اصل حجت ہیں اور یہ دونوں اِس زمانے میں اُسی طرح ہمارے پاس موجود ہیں، جس طرح اگلوں کے پاس تھیں۔

چنانچہ اِس بنیاد پر کوئی محکم دلیل اِس نقطۂ نظر کے حق میں قائم نہیں کی جا سکتی۔

اِس کے بعد دو باتیں کہی جا سکتی ہیں: ایک یہ کہ دین پر عمل کے لحاظ سے جو مقام اگلوں کو حاصل تھا، وہ اِس زمانے کے لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوسری یہ کہ فہم و ذکا کے اعتبار سے جو درجہ اُن کا تھا، اُس تک اب کسی کے لیے پہنچنا ممکن نہیں رہا۔

اِن میں سے آخری بات محض ادعا ہو گی جس کے لیے کوئی ثبوت نہ قرآن و حدیث میں موجود ہے، نہ علم و تجربہ سے اِس کی تصدیق ہوتی ہے۔ رہی پہلی بات تو وہ قرآن مجید کی نص کے خلاف ہے۔ قرآن نے بالصراحت فرمایا ہے کہ عملی لحاظ سے دین میں سب سے اونچا درجہ 'السَّابِقُوْن' کا ہے اور یہ جس طرح اگلوں میں تھے، اُسی طرح پچھلوں میں بھی ہوں گے۔ سورۂ واقعہ میں ہے:

| | |
|---|---|
| وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ، اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ، فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ، ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ، وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ. (۵۶:۱۰-۱۴) | ''اور سبقت کرنے والے تو پھر سبقت کرنے والے ہی ہیں۔ وہی تو مقرب ہوں گے، نعمت کے باغوں میں۔ اگلوں میں سے زیادہ اور پچھلوں میں سے کم۔'' |

اِس کے علاوہ اِس نقطۂ نظر کے مؤیدین جو کچھ کہتے ہیں، وہ محض جذبات کی



Marfat.com

شاعری ہے۔ علم واستدلال کی دنیا میں اِس کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔

دوسری بڑی خرابی اِن مدارس کے نظام میں یہ ہے کہ یہ اگرچہ دینی مدارس ہیں، لیکن دین میں جو حیثیت قرآن مجید کو حاصل ہے، وہ اِن میں اِسے کبھی حاصل نہیں ہو سکی۔ دین میں وہ اِس زمین پر اللہ کی اتاری ہوئی میزان اور حق و باطل کے لیے فرقان ہے۔ اُس کی اِس حیثیت کا ناگزیر تقاضا تھا کہ اِن مدارس کے نصاب میں محور و مرکز کا مقام اُسے ہی حاصل ہوتا۔ تدریس کی ابتدا اُس سے کی جاتی اور اُس کی انتہا بھی وہی قرار پاتا۔ علم وفن کی ہر وادی میں طلبہ اُسے ہاتھ میں لے کر نکلتے اور ہر منزل اُس کی رہنمائی میں طے کی جاتی۔ جو کچھ پڑھایا جاتا، اُسی کو سمجھنے اور اُسی کے مدعا کو پانے کے لیے پڑھایا جاتا۔ نحو و ادب، فلسفہ و کلام اور فقہ و حدیث کے لیے اُسے معیار مانا جاتا اور ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اُس کی آیات بینات کی روشنی میں ہوتا۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اُس سے شروع ہوتی اور اُسی پر ختم کر دی جاتی۔ طلبہ اُس کے ہر لفظ پر مراقبہ کرتے اور اُس کی ہر آیت پر ڈیرے ڈالتے۔ اُنھیں بتایا جاتا کہ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اُس کی حکومت قائم ہے اور اُس کے خلاف اِن میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

دین میں قرآن مجید کی حیثیت یہی ہے اور یہی حیثیت اُسے اِن مدارس کے نظام میں حاصل ہونی چاہیے تھی، لیکن ہر صاحب علم اِس حقیقت سے واقف ہے کہ پہلے مرحلے میں اِن مدارس کے طلبہ محض حفظ و قراءت کے لیے اُس کی طرف رجوع کرتے



Marfat.com

ہیں اور آخری مرحلے میں جلالین و بیضاوی کے صفحات میں اُس کی کچھ زیارت کر لیتے ہیں، اِس سے زیادہ کوئی مقام اِن مدارس میں اُسے کبھی نہیں دیا گیا۔

قرآن مجید کے معاملے میں اِس رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ فکر و عمل کے لیے کوئی چیز اب حَکَم نہیں رہی اور علم اختلافات کی بھول بھلیاں میں سرگرداں ہے۔ وہ منابع جہاں سے ہمیں روشنی مل سکتی تھی، خود تیرہ و تار ہیں اور ہمارے مدرس و ملا اور اِس کتاب منیر میں بالعموم وہی تعلق قائم ہے جس کے بارے میں اقبال نے اپنا لف و نشر ترتیب دیا تھا کہ:

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کور مادر زاد و نور آفتاب

اِن مدارس کے نظام میں تیسری بڑی خرابی یہ ہے کہ اِن کا نصاب نہایت فرسودہ اور ہماری علمی اور دینی ضرورتوں کے لیے بالکل بے حاصل ہے۔ یہ نصاب، جیسا کہ عام خیال ہے، ملا نظام الدین نے ترتیب دیا یا پھلواری شریف کے سجادہ نشین شاہ سلیمان کی رائے کے مطابق اِس کا بیج ابتدا میں ملا فتح اللہ شیرازی نے بکھیرا اور یہ خودرو پودوں کی طرح آپ سے آپ اِس صورت میں نمودار ہو گیا، بہرحال ہمارے اُس دور کی پیداوار ہے، جب علم کے اصل ماخذوں سے ہم بے تعلق ہو چکے تھے۔ قرآن مجید کو جو مقام اِس نصاب میں دیا گیا ہے، وہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ حدیث اگرچہ شامل نصاب ہے، لیکن اِس کے لیے دورہ کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اُس سے تدبر حدیث کا کوئی ذوق



Marfat.com

پڑھنے اور پڑھانے والوں میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ جاہلی ادب کی اہمیت اِس نصاب میں کبھی مانی نہیں گئی۔ چنانچہ قرآن مجید کی زبان اور اُس کے اسالیب کی ندرتوں سے اِس کے طلبہ کم ہی کبھی واقف ہوئے ہیں۔ نحو و بلاغت کی جو کتابیں اِس میں شامل ہیں، اُن میں چونکہ منطق زیادہ اور نطق کی رعایت بہت کم ملحوظ رکھی گئی ہے، اِس وجہ سے اِن فنون کے اعلیٰ مباحث کو سمجھنے کا ذوق اگر طالب علم میں ہو بھی تو اِن کتابوں کے پڑھنے کے بعد باقی نہیں رہتا۔ منطق و فلسفہ اور علم کلام کے لیے جو کچھ اِس نصاب میں رکھا گیا ہے، اُس کا ضرر اُس کی منفعت سے زیادہ ہے۔ فقہ احناف ہی کی پڑھائی جاتی ہے، فقہ اسلامی کی تدریس کا کوئی تصور اِس کے بنانے والوں کے ذہن میں کبھی نہیں رہا۔ اصول کا فن ہم مسلمانوں کے لیے مایۂ افتخار ہے، لیکن اِس کے لیے بھی کوئی ایسی کتاب اِس میں شامل نہیں کی گئی جو اجتہادی بصیرت پیدا کرنے والی ہو۔ دو صدیاں اِس نصاب پر گزر گئیں، لیکن دنیوی علوم میں بھی یہ کسی ترقی کو قبول کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوا۔ فلسفہ، نفسیات، علم الاقتصاد، علم الافلاک، طبیعیات، علم السیاسہ اور اِس طرح کے دوسرے فنون میں جو تحقیقات اِس دوران میں ہوئی ہیں، وہ ابھی تک اِس میں بار نہیں پا سکیں۔ اِسے حسن عقیدت ہی کا کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ صدرا و میبذی[1] کو بھی

---

[1] درس نظامی میں فلسفہ کی دو کتابیں۔ یہ دراصل اِس مضمون میں اثیر الدین ابہری کی کتاب ''ہدایۃ الحکمہ'' کی دو شرحیں ہیں جو اپنے لکھنے والوں ہی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اِن میں اول الذکر ملا صدر الدین شیرازی اور موخر الذکر معین الدین میبذی کی تصنیف ہے۔



Marfat.com

اِس میں حیاتِ ابدی حاصل ہوگئی ہے۔ ہمارے بزرگ اِسے اِس قدر مقدس سمجھتے ہیں کہ اِس کی اِن کتابوں میں بھی کوئی تبدیلی اُن کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ نئے علوم دنیا پر حکومت کر رہے ہیں، لیکن اِس نصاب کے پڑھنے والے ابھی تک اُن کے وجود پر بھی مطلع نہیں ہوئے۔ دنیا نے اِن دو صدیوں میں بہت کچھ مانا اور ماننے کے بعد پھر انکار کر دیا، لیکن یہ نہ اِس ماننے سے واقف ہوئے اور نہ اِس انکار کی کوئی خبر اُنھیں ابھی تک پہنچی ہے۔

[۲]

اِس کے بعد اب عام دنیوی تعلیم کی درس گاہوں کو لیجیے۔ یہ جس نظام پر قائم ہیں، اُس کی تعمیر میں ابتدا ہی سے خرابی کی بہت سی صورتیں مضمر رہی ہیں۔ اِس کی بنیاد برصغیر کے برطانوی حکمرانوں نے رکھی تھی۔ اُنھیں یہاں سے گئے ہوئے اب پینتالیس سال ہونے کو ہیں، لیکن ہم اِس کی اصلاح تو کیا کرتے، حقیقت یہ ہے کہ اِس ملک میں ہر نئی صبح غلامی کی اِس میراث کے ساتھ ہماری محبت میں اضافے کا پیغام لے کر طلوع ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ نظام اُن ساری خرابیوں کے ساتھ جو اُس کی پیدایش کے وقت سے اِسے لاحق ہیں، ابھی تک ہم پر مسلط ہے۔

اِس نظام کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک لادینی نظام ہے۔ اِس کی بنا اِس اصول پر رکھی گئی ہے کہ عالم کا عقدہ کسی مابعد الطبیعیاتی اساس کے بغیر بھی کھل سکتا اور انسان کا مسئلہ خود اُس کے بنانے والے کی رہنمائی کے بغیر



Marfat.com

بھی حل ہو سکتا ہے۔ یہی اصول ہے جس پر مغرب میں فلسفہ، سائنس، عمرانیات اور دوسرے علوم و فنون کا ارتقا اِن پچھلی دو صدیوں میں ہوا ہے اور جسے ابھی تک مغربی فکر میں اصل اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ مغرب میں سب اہل فکر خدا کے منکر نہیں ہو گئے، لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کی فکر کا بنیادی مقدمہ اِس انکار ہی پر استوار ہوا ہے۔ چنانچہ اِن علوم کی تدریس کے لیے جو نصاب اِن درس گاہوں میں رائج ہے، اُس میں یہ کارخانۂ عالم بغیر کسی خالق کے وجود میں آتا اور بغیر کسی مدبر ہی کے چلتا نظر آتا ہے۔ انسان اِس میں آپ ہی اپنی تقدیر بناتا اور آپ ہی اُسے بگاڑتا ہے۔ قانون و سیاست اور معیشت و معاشرت کے سارے اصول اِس میں 'بغیر ھدی و لا کتاب منیر' وجود میں آتے اور دنیا اِنھی کی روشنی میں اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ انسان کی تاریخ اِس میں انسان سے شروع ہوتی اور انسان ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ ذات خداوندی کے لیے اِس میں نہ ابتدا میں کوئی جگہ ہے، نہ انتہا میں۔ اِس سلسلۂ روز و شب کے بارے میں یہ بات اِس نصاب کی روح میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ وہی درحقیقت ابتدا، وہی انتہا اور وہی باطن و ظاہر ہے۔ چنانچہ اِس کی تعلیم پانے والے بغیر کسی ترغیب و دعوت کے آپ سے آپ اِس نقطۂ نظر کے حامل بن جاتے ہیں کہ زندگی خدا سے بے تعلق ہو کر بھی بسر کی جا سکتی ہے اور دنیا کا نظام اُس کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر بھی چلایا جا سکتا ہے۔ دینیات کی تعلیم، بے شک اِس میں لازم کر دی گئی ہے، لیکن کسی بنیادی تبدیلی کے بغیر اِس عنایت کا نتیجہ اِس کے



Marfat.com

سوا کچھ نہیں نکلا کہ یہ نصاب سراپا تضاد اور اِس کے پڑھنے والوں کے دماغ دینی و لا دینی کی رزم گاہ بن گئے ہیں۔ ببول کے درختوں پر انگور کی بیل چڑھانے اور حکایت بادہ و جام سنانے کے بعد زم زم کے فضائل بیان کرنے سے جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے، وہی اِس نصاب میں دینیات کا پیوند لگانے سے حاصل ہوا ہے۔ اِس کی سب سے نمایاں مثال وہ لوگ ہیں جنھیں عام اصطلاح میں دانش ور کہا جاتا ہے۔ اُن کی زبان اور اُن کا قلم گواہی دیتا ہے کہ حق تو درحقیقت وہی ہے جسے ائمۂ مغرب حق قرار دیں، لیکن قرآن کی تعبیر بھی اگر اِس 'حق' کے مطابق کر دی جائے تو اُسے ایک مقدس مذہبی کتاب کی حیثیت سے قابل احترام قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن کا وجود ایک مجموعۂ تضادات ہے۔ خدا کا وہ انکار نہیں کرتے، لیکن اُس کی عبادت کے لیے روزہ و نماز کی پابندی پر اصرار بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ آخرت کے وہ منکر نہیں ہیں، لیکن اُس کے لیے دنیا کی کچھ لذتوں کو چھوڑنے کے لیے بھی اُن کا دل آمادہ نہیں ہوتا۔ رسالت کو وہ مانتے ہیں، لیکن رسول کے احکام بھی اُنھیں اِس دور میں قابل عمل نظر نہیں آتے۔ قرآن کی تلاوت سے وہ اپنی مجلسوں کی ابتدا کرتے ہیں، لیکن پادشاہ ارض و سما کے فرمان واجب الاذعان کی حیثیت سے اپنے دستور و قانون پر اُسے بالاتر قرار دینا بھی اُنھیں گراں گزرتا ہے۔ اُن کی ہستی ایک آئینہ ہے جس میں ہم اِس پیوند کاری کے نتائج بچشم سر دیکھ سکتے اور اُن سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ اِس نظام تعلیم نے اُن کا گلا گھونٹ دیا اور روح دین اُن کے بدن سے نکال دی ہے۔ یہ بظاہر زندہ نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ:



Marfat.com

## مردہ ہیں، مانگ کے لائے ہیں فرنگی سے نفس

اِس نظام کی اِس لادینی فطرت نے صرف یہ ذہنی ارتداد ہی ہماری قوم کے کارفرما عناصر میں پیدا نہیں کیا، اِس کے ساتھ اُنھیں اُس سیرت و کردار سے بھی محروم کر دیا ہے جس کے بغیر کوئی قوم دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اِس میں یہ بات کبھی پیش نظر نہیں رہی کہ تعلیمی ادارے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لیے قائم نہیں کیے جاتے، اُن کا ایک بڑا مقصد کسی قوم کے بنیادی نظریے کے مطابق اُس کی آیندہ نسلوں کی تربیت اخلاق اور تہذیب نفس بھی ہے۔ یہ مقصد، اُسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ دوسری تدبیروں کے ساتھ بالخصوص اساتذہ کے انتخاب میں یہ بات ہر حال میں ملحوظ رکھی جاتی کہ وہ صرف اپنے مضمون ہی کے ماہر نہ ہوں، اِس کے ساتھ دین کے معاملے میں بالکل یک سو، اُس کے احکام کے پیرو اور اُس نے جن اخلاق عالیہ کی تعلیم دی ہے، اُس کا بہترین نمونہ بھی ہوں۔ کسی قوم کی تہذیب اور اُس کی اخلاقی تربیت کا کوئی طریقہ اِس سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتا۔ ماں کی آغوش کے بعد اِس معاملے میں اہم ترین عامل استاد کی شخصیت ہی ہوتی ہے۔ وہ اگر کسی نظریے کو پوری سچائی کے ساتھ مانتا اور پوری دیانت داری کے ساتھ اُس کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہو تو اُس کے طلبہ یقیناً اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے اِس نظام تعلیم میں اِس چیز کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ چنانچہ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ عزیمت و استقامت، حوصلہ و مروت، نظم و ضبط اور صبر و ثبات جیسی اعلیٰ صفات اِس قوم کے نوجوانوں میں



Marfat.com

اب ہم ڈھونڈے نہیں پاتے۔ امانت، دیانت، فرض شناسی، وفاشعاری اور ایثار و قربانی قصہ ماضی ہیں۔ نظر کی عفت، طبیعت کا حسن، خیال کی بلندی، ضمیر کی پاکیزگی اور ذوق کی لطافت اب کم ہی کہیں نظر آتی ہے۔ بد دیانت، بدکار، رشوت خور، خویش پرور اور ادنیٰ خواہشوں کے غلام نوجوان ہی اب ہماری پہچان ہیں۔ ہماری یہ نئی نسل اپنی قوم کے ماضی سے بے گانہ، حال سے بے پروا اور مستقبل سے بے تعلق ہے۔ اخلاقی اقدار آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہیں اور مادی مفادات ہی حیات و کائنات کی اصل حقیقت قرار پا رہے ہیں۔ یہی فیض ہے جو ہمارے نوجوانوں نے اِس نظام تعلیم سے حاصل کیا ہے۔ اب ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارا یہ نظام تعلیم حقیقت میں:

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

[۱۹۸۷ء]

# تعلیمی نظام

ہماری قوم کا ایک بڑا مسئلہ اُس کے تعلیمی نظام کی آفات ہیں۔ اِن میں تین چیزیں بالخصوص قابل توجہ ہیں:

ایک یہ کہ ہماری تہذیبی روایت سے یہ نظام ہمارا رشتہ بتدریج منقطع کر رہا ہے۔



Marfat.com

نئی نسلوں سے ملیے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ اگلے دس بیس سال میں قومی حیثیت سے ہم اپنی یادداشت شاید کھو چکے ہوں گے۔ اِس سے پہلے عربی زبان سے بے گانگی نے چودہ سو سال اور فارسی سے بے گانگی نے گذشتہ بارہ سو سال ہماری یادداشت سے محو کر دیے ہیں۔ اب یہی معاملہ اردو کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہماری تہذیبی روایت کے تین سو سال اِس زبان سے وابستہ ہیں۔ اِس سے ہمارا رشتہ کمزور ہوا تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ صرف زبان ہے جو تہذیبی روایت کو قائم رکھتی اور پوری حفاظت کے ساتھ اُسے آگے منتقل کرتی رہتی ہے۔ اِس سے محرومی کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری آیندہ نسلیں اپنے اساطین علم و ادب کو پڑھنا تو ایک طرف، اُن کے ناموں سے بھی غالباً واقف نہیں ہوں گی۔ یہ کتنا بڑا نقصان ہے؟ اِس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو قومی شخصیت کی تعمیر میں اُن عوامل کی اہمیت کو سمجھتے ہیں جو تہذیبی روایت سے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم ہر شعبۂ زندگی میں اختصاصی تعلیم کے لیے بنیادی مہارت فراہم کرتی ہے، مگر دین کا عالم بننے کے لیے اِس طرح کی کوئی بنیاد فراہم نہیں کرتی۔ دینی مدارس اِس کوتاہی سے پیدا ہوئے ہیں اور جب تک یہ باقی رہے گی، اِسی طرح پیدا ہوتے رہیں گے۔ سوسائٹی کو جس طرح سائنس دانوں، ادیبوں، شاعروں، ڈاکٹروں اور انجینئروں کی ضرورت ہے، اِسی طرح دین کے جید علما کی بھی ضرورت ہے۔ اِس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اختصاصی تعلیم کی درس گاہیں



Marfat.com

قائم کی جائیں تو اُن میں داخلے کے لیے بنیادی اہلیت کہاں پیدا ہوگی؟ اِس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ ہم کسی شخص کو یہ اجازت تو نہیں دیتے کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم کے بغیر وہ بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر یا کسی دوسرے شعبے کا ماہر بنانے کے ادارے قائم کرے، مگر دین کا عالم بننے کے لیے اِس طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اِس مقصد کے لیے طلبہ ابتدا ہی سے ایسے مدرسوں میں داخل کر لیے جاتے ہیں، جہاں اُن کے مستقبل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ قدرت نے، ہوسکتا ہے کہ اُنھیں ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان یا شاعر و ادیب اور مصور بننے کے لیے پیدا کیا ہو، مگر یہ مدارس اُن کی اہلیت، صلاحیت اور ذوق و رجحان سے قطع نظر اُنھیں عالم بناتے اور شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد زندگی کے کسی دوسرے شعبے کا انتخاب کر لینے کے مواقع اُن کے لیے ختم کر دیتے ہیں۔ پھر جن کو عالم بناتے ہیں، بارہ سال کی عمومی تعلیم سے محرومی کے باعث اُن کی شخصیت کو بھی ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں جس سے وہ اپنے ہی معاشرے میں اجنبی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ صورت حال اپنی اصلاح کے لیے غیر معمولی اقدامات کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ارباب حل وعقد اِس کی توفیق پائیں تو اِس کے لیے ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ مذہبی اور غیر مذہبی اور اردو اور انگریزی ذریعۂ تعلیم کی ہر تفریق ختم کر دی جائے۔ تمام معاشرتی علوم اردو میں، سائنس اور ریاضی انگریزی زبان میں اور



Marfat.com

دینیات براہ راست عربی زبان میں پڑھائی جائے۔

۲۔ دینی تعلیم کے لیے پہلی پانچ جماعتوں میں صرف نماز کی دعائیں، حج کا تلبیہ اور 'ق' (۵۰) سے 'الناس' (۱۱۴) تک قرآن مجید کے آخری دو باب یاد کرائے جائیں۔ عربی زبان کی تعلیم چھٹی جماعت سے شروع کی جائے، زبان کے ضروری قواعد سکھانے کے بعد قرآن مجید کو ریڈر بنا دیا جائے جسے طلبہ بارھویں جماعت تک پورا ختم کر لیں۔ مطالعۂ پاکستان اور اسلامیات کا جو مضمون اس وقت شامل نصاب ہے، اُسے ختم کر دیا جائے۔ اِس کی جگہ تاریخ پڑھائی جائے جس میں طلبہ دنیا کی تاریخ بھی پڑھیں اور اِس کے ساتھ پاکستان سمیت مسلمانوں کی پوری تاریخ کا مطالعہ بھی کر لیں۔

۳۔ فارسی اردو کے نہایت قریب ہے۔ اِس کے ضروری قواعد زیادہ سے زیادہ تین ماہ میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ آٹھویں سال میں اِسے بھی اردو زبان کی تعلیم ہی کا ایک حصہ بنا کر پڑھا دیا جائے۔

۴۔ سائنس اور آرٹس کے ساتھ نویں سال سے دینیات گروپ شروع کیا جائے جس میں عربی زبان و ادب، تاریخ، فلسفہ، عالمی ادبیات اور دین و شریعت کی مختلف تعبیرات کا مطالعہ اِن مضامین کے ابتدائی تعارف کی حد تک کرا دیا جائے۔ جو طلبہ دین کے عالم بننا چاہیں، اُنھیں موقع دیا جائے کہ وہ اِس گروپ کا انتخاب کریں اور اِس شعبے کی اختصاصی تعلیم کے اداروں میں داخلے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر لیں۔

۵۔ طب اور انجینئرنگ کی طرح دینی تعلیم کے اداروں کو بھی اختصاصی تعلیم کے



Marfat.com

اداروں کی حیثیت سے قومی تعلیمی نظام کا حصہ بنایا جائے۔ نیز پابند کیا جائے کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم کے بغیر وہ کسی طالب علم کو اپنے اداروں میں داخل نہیں کریں گے۔ اِن میں سے جو ادارے اعلیٰ تعلیم کے لیے مسلمہ معیارات کے مطابق ہوں، اُن کی ڈگریاں اِن اصلاحات کے بعد بی اے، ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے تسلیم کر لی جائیں۔

[۲۰۰۹ء]

# ہماری مسجدیں

ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں مسجدوں کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سنت اِن کے بارے میں قائم کی، وہ یہ تھی کہ اِن میں نماز جمعہ کا خطاب اور اُس کی امامت امیر ریاست اور اُس کے عمال کریں گے۔ اُن کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اگر کسی حجت شرعی کی بنا پر اُن کی معذوری کی صورت میں اِس مقصد کے لیے منبر پر کھڑا ہوگا تو اُن کی اجازت سے اور اُن کے قائم مقام کی حیثیت سے کھڑا ہوگا۔

یہ درحقیقت خدا کے آخری پیغمبر کی طرف سے اِس بات کا اعلان تھا کہ دین حق



Marfat.com

میں مسجد ہی ایوان اقتدار ہے۔ یہاں کوئی پوپ ہے نہ برہمن۔ مسلمان جسے اپنی سیاست کا امام بنائیں گے، اُن کی عبادت کا امام بھی وہی ہوگا۔ مذہب و سیاست کی ہر تفریق اب ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو خلافت آپ کے صحابہ نے قائم کی، اُس میں یہ سنت پوری شان کے ساتھ قائم رہی، لیکن بعد کے زمانوں میں جب حکمران اپنے اعمال کی وجہ سے لوگوں کے روبرو کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے تو مسجدوں کا منبر خود اُنھوں نے علما کے سپرد کر دیا۔ یہ ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ الم انگیز حادثہ ہے۔ اِس کے نتیجے میں، اب ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اپنے جلال اور سیاست اپنے جمال سے محروم ہو گئی ہے۔ وہ جنھیں سرفرازی حاصل ہونی چاہیے تھی، صدیوں سے سرنگوں ہیں اور جنھیں سرنگوں ہونا چاہیے تھا، اُنھوں نے اِس طرح سر اٹھائے ہیں کہ اُنھیں جھکانے کی کوشش کی جائے تو ہزاروں فتنے سر اٹھاتے ہیں۔ مسجدیں مختلف فرقوں کے حصار ہیں جن میں بیٹھ کر اُن کے سرخیل ایک دوسرے پر سنگ باری کرتے ہیں۔ جمعہ کے منبر سے جو ریاست اُنھیں حاصل ہوئی ہے، اُس نے پیشہ ور مولویوں کا ایک ایسا گروہ ہمارے معاشرے میں پیدا کر دیا ہے جس کا وجود علما کے لیے باعث ننگ ہے۔ یہ جب کسی کی مخالفت میں زبان کھولتے ہیں تو اُس سے کژدم بکھرتے اور اژدر پھنکارتے ہیں۔ دعوت حق کا ہر علم بردار ان کے تیروں سے چھلنی ہوتا ہے اور علم و تحقیق ہمیشہ ان کے پتھروں کی زد میں رہتے ہیں۔ ہر مسجد کا دروازہ فرقہ دارانہ ضلالتوں کی تبلیغ کے لیے



Marfat.com

کھلا اور قرآن وسنت کی خالص دعوت کے لیے بند ہے۔ کسی صاحب علم کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر تعلیم و دعوت کا وہ فرض ادا کر سکے جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر عائد ہوتا ہے۔

ہماری مسجدوں کا یہ بگاڑ کسی صاحب نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اِس کی اصلاح یقیناً اُس سنت کو زندہ کرنے ہی سے ہو سکتی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ ہمارے نزدیک، اِس کے لیے حسب ذیل اقدامات ضروری ہیں:

۱۔ ریاست میں ہر انتظامی وحدت کا مرکز اُس کی جامع مسجد کو قرار دیا جائے اور انتظامی وحدتوں کی تقسیم اِس طرح کی جائے کہ ہر وحدت کی جامع مسجد اُس کی پوری آبادی کے لیے کفایت کرے۔

۲۔ تمام وحدتوں کے لیے ضروری انتظامی دفاتر اور عدالتیں اِن جامع مسجدوں ہی سے ملحق قائم کی جائیں۔

۳۔ ریاست کے صدر مقام اور ہر صوبائی دار الحکومت میں ایک مسجد کو مرکزی جامع مسجد قرار دیا جائے۔

۴۔ نماز جمعہ کا خطاب اور اُس کی امامت ریاست کے صدر مقام کی مرکزی جامع مسجد میں سربراہ مملکت، صوبوں میں گورنر اور مختلف انتظامی وحدتوں کی جامع مسجدوں میں اُن کے عمال کریں۔

۵۔ اِن کے علاوہ تمام مساجد میں جمعہ کی اقامت ممنوع قرار دی جائے۔



Marfat.com

۶۔ مساجد کا اہتمام حکومت خود کرے۔

۷۔ ہر صاحب علم کو حق حاصل ہو کہ وہ جس مسجد میں چاہے، اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم و تدریس اور اصلاح وارشاد کی مجالس منعقد کرے۔

[۱۹۸۷ء]



Marfat.com